جلد ۶۷ اپریل ۱۹۶۷ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

چندہ سالانہ: سات روپے

قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۷	اپریل ۱۹۶۷ء	عدد ۲

اشارات:	عبدالحمید صدیقی	۲
مقالات:		
دین کا جامع تصور	سید قطب شہیدؒ ترجمہ: عبدالحمید صدیقی	۱۹
پاکستان کے معاشرتی و سیاسی نظام میں اسلامی قانون کا منصب و مقام	جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس صاحب سابق جج سپریم کورٹ آف پاکستان	۲۷
نکاح فاسد اور نکاح باطل پر ایک اصولی بحث	ملک غلام علی صاحب	۴۵
رسائل و مسائل		
کشمکشِ حق و باطل اور اس کی حقیقت	ابوالاعلیٰ مودودی	۵۴
مطبوعات	ادارہ	۵۸

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵ اے، ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قوموں اور ملکوں میں ذہنی اور فکری انقلاب بارش کی طرح خود بخود نہیں آجاتا بلکہ انقلاب کے علمبرداروں کو اس کی کامیابی کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے تب کہیں جاکر عوام کے قلب و دماغ اس انقلاب کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس تگ و تاز کے یوں تو متعدد میدان ہیں مگر یہ عام طور پر دو راستے اختیار کرتی ہے ایک یہ کہ جن نظریات کو فروغ دینا مقصود ہو اُن کا پرچار کیا جائے، اُن کی عظمت اور برتری کا نقش بٹھانے کے لیے پُورا زور لگایا جاتے۔ اور جو نظریات اس کی ضد ہیں اور جنہیں مٹانا مقصود ہو انہیں غیر عاقلانہ بلکہ احمقانہ ثابت کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی جاتے یہاں تک کہ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ ان افکار و تصورات سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز غلط نہیں۔ اس طریقہ میں پہلے افکار و نظریات کی جنگ لڑی جاتی ہے اور جب اس میدان میں فتح حاصل ہو جائے تو پھر فاتحانہ تصورات کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کی جاتی ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرا طریق یہ ہے کہ آغاز میں نہ تو دلپسند نظریات کا براہِ راست ذکر کیا جائے اور نہ مذموم افکار سے کسی طرح کا تعارض کیا جاتے بلکہ اپنے پسندیدہ تصورات کی بنیاد پر جو اجتماعی ڈھانچہ بنانا مقصود ہو اس کی سب سے پہلے بزور بازو تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔ عوام جب اس ڈھانچے کو پہلی بار دیکھیں گے تو وہ یقیناً اس سے بعد و بیگانگی محسوس کریں گے مگر جو لوگ انقلاب کے داعی ہیں، انہیں عوامی احساسات کو خاطر میں لانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اجتماعیت کا دباؤ اُن کے اعمال کو خود بخود نئے سانچوں میں ڈھالتا چلا جائے گا اور اس طرح نئے ماحول سے عوام کی مغائرت اور اجنبیت دُور ہونی شروع ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ وہ اس ذہنی کرب اور اضطراب

سے بھی نجات حاصل کریں گے جو آغاز میں بُعد و بیگانگی کی وجہ سے وہ محسوس کر رہے تھے ۔

اس دوسرے طریقِ انقلاب میں سب سے پہلے نئے ماحول سے عوام کی عملی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ وہ خواہ شروع میں اپنے آپ کو اس مطابقت کے لیے آمادہ نہ پاتے ہوں لیکن جب اُن کے اعمال نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونا شروع ہو گئے تو ان کے اندر فطرتاً یہ خواہش پیدا ہو گی کہ وہ زندگی کی جس روش کو اختیار کر رہے ہیں اُس کے لیے فکری اور اخلاقی تائید بھی حاصل کریں ۔ کوئی ہوشمند انسان زیادہ دیر تک کسی تضاد میں مبتلا ہونا پسند نہیں کرتا ۔ وہ یا تو ماحول کو اپنے افکار کے مطابق دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے ۔ یا پھر اگر وہ اپنے آپ کو اس میں بے بس محسوس کرے تو وہ اپنے افکار و تصورات کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا ہے تاکہ اس کی وہ خلش دُور ہو جو فکر و عمل میں تناقض کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جو اُس کے لیے بعض صورتوں میں بڑی تشویشناک صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں اور گوشوں میں مکمل ہم آہنگی چاہتا ہے اور اگر اُن کے درمیان عدم مطابقت ہو تو پھر اُن میں مناسب تغیر و تبدل کر کے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم عنان کر دیتا ہے ۔ مذہب اور اخلاق کی پوری تاریخ انسان کے اس طرزِ عمل کی شہادت فراہم کرتی ہے ۔

دَورِ حاضر میں پروٹسٹنٹ مذہب کا وجود اس کلیہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے ۔ صنعتی دَور نے مال و دولت کی جو نہ مٹنے والی ہوس پیدا کی ہے اور اس وجہ سے جو مادہ پرستانہ تصورِ حیات پروان چڑھا ہے اور اس کے نتیجے میں افادیت کو جو اخلاق کا رہنما اصول قرار دیا گیا ہے ، پروٹسٹنٹ مذہب نے ان تمام تغیرات کے لیے سندِ جواز فراہم کی ہے ۔ اس مذہب کی کوئی ایک قدر ساور اس کا کوئی ایک ضابطۂ اخلاق بھی ایسا نہیں جو مستقل اور پائیدار ہونے کی بنا پر اپنے پیروؤں سے اس کی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرے ۔ اس تحریک کے داعی مارٹن لوتھر نے پورے مذہب کو ایک ایسا سیال مادہ بنا دیا ہے جو ہر سانچے میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھل جاتا ہے ۔ اس لیے اس کے علمبرداروں کو حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں

نہ کبھی پہلے کوئی وقت محسوس ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

انگلستان میں پچھلے دنوں صحبتِ ہم جنس (HOMOSEXUALITY) کو جائز قرار دینے کے لیے مذہبی حلقوں کی طرف سے جو دلائل پیش کیے گئے وہ اس غلط اندازِ فکر کے پوری طرح شاہد ہیں۔

یورپ کی یہ نئی تحریک جسے ہم نشأۃ ثانیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، احیائے مذہب کی تحریک نہ تھی بلکہ فی الحقیقت یہ مذہب سے مکمل انحراف، اور ماضی سے عملاً بغاوت کی ایک لہر تھی جس نے اہلِ یورپ کو خداوند تعالیٰ کی غلامی سے نکال کر مادہ پرستی کے طلسم میں مبتلا کر دیا۔ اس نئے سامری نے ان کے لیے کئی ایک جھوٹے خدا گھڑ کر اُن سے ان کی پرستش کا مطالبہ کیا۔ ان معبودانِ باطل میں وطن اور قوم کا بُت، رنگ اور نسل کا بُت خاص طور پر مشہور ہیں۔ چونکہ اس تحریک کا خمیر ماضی کی ہر چیز کے خلاف بغاوت اور انحراف سے اٹھایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مغرب نے صنعتی دور میں داخل ہونے کے ساتھ ہر اُس قدر کو پامال کرنا ضروری سمجھا جو ماضی سے کچھ تعلق رکھتی تھی اور اس طرح وہ سارے اخلاقی ضابطے بڑی بے رحمی کے ساتھ روند دیئے گئے جو کبھی انسانیت کا سرمایۂ افتخار تھے اور جن کی وجہ سے آدمیت کا بھرم قائم تھا۔

اخلاقی اقدار کی پامالی اور مذہبی روایات کے خلاف بغاوت کی وجہ سے سماجی زندگی میں بڑے تباہ کن اثرات رونما ہوئے۔ شرم و حیا، عصمت و عفت، نیکی اور پاکبازی، غرض انسانی عزّ و شرف کی وہ ساری قدریں جن کی اساس مادی سود و زیاں کے بدلتے ہوئے پیمانوں کے بجائے اخلاق و روحانیت کی مستقل بنیادیں تھیں، بڑی سرعت کے ساتھ مٹنے لگیں اور انسان نے حسّی خواہشات کی اس حد تک غلامی اختیار کی کہ اس کی حیثیت ایک آزاد جانور کی سی بن کر رہ گئی۔ مغرب کی بعض جدید تحریکات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان بڑی سرعت کے ساتھ انسانیت کی بلند سطح سے گر کر حیوانیت کی پست سطح پر اتر رہا ہے۔ برہنگی کا جو جنون آج مغرب میں پایا جاتا ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے اس رجعت قہقری کا

مظہر ہے۔

انسان کے سفلی جذبات پر سے جب اخلاقی ضوابط کا تسلط ختم ہوا تو انسان بالکل ایک بے لگام بپھرے ہوئے جانور کی سی حرکتیں کرنے لگا ظاہر بات ہے کہ افکار و نظریات کی اس بے راہ روی اور جذبات کی اس مطلق العنانی کے ساتھ کسی اجتماعی زندگی کا وجود ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اب نئے آزاد منش انسانوں کو ایک اجتماعی ہیئت میں منظم رکھنے کے لیے معاشرے کو اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرنی پڑی۔ اس سے ریاست کا دائرہ کار غیر معمولی حد تک بڑھا معیشت کا حلقہ بے حد وسیع ہوا اور معاشرتی دباؤ میں شدید اضافہ ہوا اور اس طرح انسان اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر معاشرتی، معاشی اور سیاسی جکڑ بندیوں کا غلام بن کر رہ گیا۔ یہ نئی غلامی بالکل فطری نتیجہ ہے مذہب سے آزادی کا۔ اگر ایک انسان زندگی کے اعلیٰ و ارفع اصولوں کو اپنا کر خود اپنے آپ کو کسی ضابطے کا پابند نہیں بناتا تو پھر اسے خارجی دباؤ سے ایک مخصوص روش اور ایک معیّن اسلوب حیات اپنانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جتنی کوئی قوم اخلاقی اصولوں سے منحرف اور روایات کی باغی ہو گی اسی نسبت سے اُس کا اجتماعی ڈھانچہ سخت اور بے حس ہو گا۔ جرمنی میں مارٹن لوتھر نے لوگوں کو مذہب سے بغاوت اور ماضی کی روایات سے انحراف کا جو سبق دیا اس سے وہاں آمریت کو فروغ ہوا۔ چنانچہ یہ بات جرمن قوم کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے کہ وہ مضبوط قسم کی اجتماعی جکڑ بندیوں کے بغیر اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر نہیں لگا سکتی۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی بے پناہ قوت عطا کی ہے لیکن ماضی سے انحراف اور مذہبی ضابطۂ اخلاق سے بے نیازی نے اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور اعتدال کو ختم کر دیا ہے اور اس کا جذباتی پن مختلف اوقات میں نہایت تند و تیز تحریکات کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

جرمن قوم کا تو مذہب سے تھوڑا سا رشتہ بہر حال قائم ہے اس لیے اس کی اجتماعی جکڑ بندیوں میں

کبھی کبھی ڈھیلا پن پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں روس کے اندر جو سرخ انقلاب رونما ہوا چونکہ اُسے مذہب اور اس کی روایات کو یکسر مٹانا مقصود تھا اس لیے وہاں زیادہ شدید اور سخت جکڑبندیوں سے کام لینا پڑا تاکہ "روح کے باغی" انسان کو ایک نظم وضبط کا پابند رکھا جائے۔

جس طرح ہوا پانی اور خوراک انسانی جسم کی بنیادی ضرورت ہے بالکل اسی طرح مذہب انسانی روح کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ بھوک اور پیاس کا ستایا ہوا انسان بسا اوقات بیچارگی کے عالم میں اپنا جذباتی اور دماغی توازن کھو کر غیر آئینی اور ناپسندیدہ حرکات پر اُتر آتا ہے بالکل اسی طرح مذہب سے بیگانہ اور اس کی روایات سے ناآشنا آدمی دیوانوں کا سا طرز عمل اختیار کرتا ہے۔

انسان کو اندر سے کسی نظم کا پابند بنانے کیلیے مذہب انتہائی ضروری ہے تاکہ اس کے فکر واحساس میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔ روس نے جب مذہب سے مکمل بغاوت کی راہ اختیار کی تو اس کے لیے یہ بات ناگزیر تھی کہ وہ اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا بے رحم ڈھانچہ تیار کرے جس میں روحانیت واخلاق سے محروم لوگوں کو نہ صرف اجتماعی زندگی کا پابند بنایا جائے بلکہ اُن کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا جائے۔

اس بے رحم ڈھانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے پہلے اہلِ روس کو ذہنی طور پر تیار نہ کیا گیا بلکہ مختلف قسم کی سازشوں کے ذریعہ سے اشتراکیت کے علمبرداروں نے پہلے حکومت پر قبضہ کیا اور پھر اپنے نظریات کی بنیاد پر زبردستی اجتماعی نظام کی تشکیل کر دی۔ عوام جب اس کے شکنجوں میں پوری طرح کسے جانے کی وجہ سے بالکل بے بس ہو گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسے پسند کریں نہ کریں مگر اُن کے اعمال کو بہر حال وہی نہج اختیار کرنی ہے جو اشتراکیت نے اُن کے لیے متعین کی ہے تو انہوں نے اپنی ذہنی آویزش کو دُور کر کے اطمینان حاصل کرنے کے لیے اپنے افکار میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کی۔ انسان جب بھی کسی غلط راہ پر پڑتا ہے تو پہلے چند قدم بُرائی سمجھ کر ہی اٹھاتا ہے۔ پھر اُسے ناگزیر بُرائی سمجھ کر اس کے خلاف جذبۂ نفرت وحقارت کو رفتہ رفتہ کم کرتا ہے۔ ایک لمبی مدت کے بعد یہ ناگزیر برائی فطری

ضرورت بن جاتی ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ایک مستحسن فعل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے اندر وہ مجبوری کا احساس ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ابتداءً اسے اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا ۔

گزشتہ صفحات میں اس بات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ یورپ میں سب سے پہلے صنعتی حالات میں اچانک تبدیلی کی وجہ سے وہاں کے اجتماعی ڈھانچے بدلنے شروع ہوئے تھے ۔ یہ ڈھانچے بڑے مضبوط تھے ۔ ان کے مقابلے میں مذہب کے علمبرداروں نے بڑی بزدلی اور پست ہمتی کا ثبوت دیا اور اس کے اصولوں کو اجتماعی ڈھانچوں کے مطابق خود بدلتے رہے ۔ تبدیلی کا یہ عمل اس حد تک جاری رہا کہ مذہبی اقدار کی امتیازی حیثیت ہی ختم ہو گئی ۔ آج عیسائیت کا جو پروٹسٹنٹ اڈیشن پایا جاتا ہے اُسے دیکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض اضافی عمل کی حیثیت سے اہلِ مغرب کے ساتھ چپکا ہوا ہے ۔ وہ کسی کام بھی اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کا محتاج نہیں پاتے ۔ اگر اہل یورپ کو سرمایہ داری کے فروغ کے لیے سود کو جائز کر دینے کی ضرورت پیش آئی تو اُسے مذہب کی بارگاہ سے سندِ جواز مل گئی ۔ اگر جارحانہ قوم پرستی کے جنون کے لیے غلط طرزِ فکر کی ضرورت محسوس ہوئی تو مذہب نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی عالمگیر حیثیت کو ختم کر کے انسانوں کے سامنے قومیت کا بُت تراش کر رکھ دیا ۔ کوئی ایک مقام بھی ایسا نہ تھا جس پر مذہب نے انسانیت کے قافلوں کو غلط راہوں پر جانے سے روکنے کی کوشش کی ہو ۔ مذہب کے علمبرداروں کی حیثیت خیمہ برداروں کی سی بن گئی تھی ، جو مذہب کے خیمے اٹھائے ہوئے بڑی خاموشی کے ساتھ قافلوں کے پیچھے چل رہے تھے ، اور انہیں جس جگہ بھی مذہب کے سائے میں سستانے کی ضرورت پیش آئی وہ انہیں حکم دیتے اور یہ بیچارے ان کے لیے مذہب کا سایہ مہیا کر دیتے ۔ انسان سفر میں دقّت اور دشواری اُس وقت محسوس کرتا ہے جب خیمے اس سے دُور ہوں ۔ مگر جب اجتماعی زندگی کی تگ و دو میں مذہب کے علمبردار خیمہ برداروں کی طرح انسانوں کے پیچھے گامزن رہیں تو اُن کے اندر وہ احساسِ زیاں کبھی پیدا نہیں ہونے پاتا جو ایک نہایت آرام دہ ماحول کو چھوڑنے کی وجہ سے انسان کے اندر اُبھرتا ہے ۔ انسان کے دل میں خدائے واحد کی بندگی ترک کرنے اور اہرمن کی غلامی اختیار کرنے پر اضطراب اُسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب وہ یہ محسوس کرے

کہ اُس نے بُرا غلط انتخاب کیا ہے۔ لیکن جب کوئی مذہب ان دونوں کی بندگی کو ایک ساتھ جائز قرار دے دے تو پھر اُس کے اپنانے والوں میں وہ ذہنی خلش باقی نہیں رہتی جو ایسے حالات میں انسان کو بالعموم پریشان کرتی ہے۔

مارکس نے تاریخی تغیرات کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس میں خصوصاً مذہب کے موقف اور مرتبہ کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ مذہب کی پوری تاریخ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اُس نے مسیحی پادریوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب بھی معاشرتی، معاشی اور سیاسی اصولوں کی طرح ذرائع پیداوار کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بلکہ یہ ذرائع پیداوار جس قسم کے طبقاتی تعلقات کو جنم دیتے ہیں مذہب ان کی عکاسی کرتا ہے، لہٰذا مذہب کوئی مستقل اور پائیدار لائحہ عمل نہیں بلکہ ان ذرائع کا تابع ہے اور ان کے ساتھ ہی بدلتا رہتا ہے۔

مارکس کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کو صحیح اور برحق سمجھنے کے لیے اپنے مطالعہ اور مشاہدے میں بڑی جانبداری سے کام لیتا ہے اور ڈاروِن کی طرح سلسلۂ واقعات کی جو کڑی اس کے اصولوں کی مؤید نہ ہو اُسے نظر انداز کر دیتا ہے، یا اگر بعض کڑیاں غائب ہونے کی وجہ سے اُس کے موقف کی پوری طرح تائید نہ ہوتی ہو تو انہیں خود اپنے ذہن سے گھڑ لیتا ہے۔ یہ غالباً اُس کی فنی چابکدستی ہے کہ اس نے مذہب کے معاملے میں اسلام کے تاریخی کردار کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا کہ اس سے تاریخ کی مادی تعبیر ممکن نہ تھی۔ اسلام کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے، مارکس نے تو خود مسیحیت کے بارے میں بھی کسی گہری سوچ بچار کا ثبوت نہیں دیا۔ اس نے غلطی سے یہ اندازہ لگایا کہ پروٹسٹنٹ چرچ نے مذہب کے اندر جو تغیرات کیے ہیں وہ معاشی تقاضوں کے رہینِ منت ہیں، درآنحالیکہ یہ تغیرات نفس پرستی کے مطالبہ کی وجہ سے تھے۔ ان تغیرات کا سب سے اہم سبب دینِ مسیحی کے علمبرداروں کی پست ہمتی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ ان لوگوں نے چند دنیوی فوائد کی خاطر مذہب کے معاملے میں جس بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے وہ

تاریخ کی ایک المناک داستان ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ میں صرف چند مثالیں دے کر حقیقت کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

گزشتہ چند سالوں سے مغربی ممالک میں "صحبتِ ہم جنس" کا مرض بڑی شدت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان ملکوں کے معاشی ماحول نے بعض ایسے معاشرتی تقاضے پیدا کیے ہیں جن کے تحت یہ عارضہ ناگزیر ضرورت بن گیا ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے اس کے جو متعدد وجوہ بتائے ہیں ان میں سب سے بڑا سبب آزاد شہوت رانی کا وہ بڑھتا ہوا جنون ہے جو لذتیت کی نئی نئی صورتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس بنا پر یہ مرض کوئی معاشی تقاضا نہیں بلکہ طبیعت کا ایک فساد ہے۔ اگر مسیحیت کے مبلغین بزدل نہ ہوتے تو وہ جسمانی عوارض کے معالجین کی طرح اس روحانی مرض کا بڑی ہمت اور پامردی سے علاج کرتے۔ مگر افسوس کہ ہر روحانی بیماری کے لیے انہوں نے ہر مرحلہ پر بڑی کمزوری اور بزدلی کا ثبوت دیا اور بڑی پست ہمتی کے ساتھ ہر میدان میں ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ "صحبتِ ہم جنس" کے سلسلے میں انگلستان کے لارڈ پادری نے جو تقریر کی وہ اس بزدلی کی واضح دلیل ہے۔ انہوں نے اس شرمناک برائی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ چونکہ یہ مذموم فعل اب عام لوگوں کا دل پسند مشغلہ بن چکا ہے اس لیے اس راہ میں جو قانونی رکاوٹ انہیں درپیش ہے اسے بھی دور کر دیا جائے تاکہ لوگ کھلے بندوں ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس فعل کا ارتکاب کرتے رہیں اور ان کے ذہن میں نہ تو ضمیر کی خلش رہے اور نہ قانونی احتساب کا ڈر باقی رہے۔

امریکہ کے پروٹسٹنٹ پادریوں کا ایک گروہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ پچھلے دو سال سے وہاں ۵۰ پادریوں نے ایک (COUNCIL ON RELIGION AND THE HOMOSEXUAL) قائم کر رکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ "ہم جنسی" کے خلاف کلیسا کی نفرت کو ختم کیا جائے، اس گناہ کے مرتکبین کو چرچ میں یکساں عزت کے ساتھ قبول کیا جائے، ان قوانین کو ختم کرایا جائے جو اس فعل کو جرم قرار دیتے ہیں اور "ہم جنسوں" کو پورے "شہری حقوق" دلوائے جائیں، یعنی باہمی رضامندی سے ہم جنسی کے تعلقات قائم

کرنے کے معاملہ میں وہ اسی طرح آزاد ہوں جس طرح مغربی معاشرے کے مرد و زن زنا بالرضا کے معاملہ میں آزاد ہیں۔ اس وقت تک امریکہ کی ریاست الینوئس کے قانون میں تو یہ آزادی تسلیم کی جا چکی ہے۔ اب پورے امریکہ میں اسے تسلیم کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گروہ میں لوتھران، بیپٹسٹ، ایپیسکوپل اور یونائیٹڈ چرچ آف کرائسٹ وغیرہ متعدد مذہبی فرقوں کے پیشوا شامل ہیں۔ ان میں سے ایک پادری صاحب رابرٹ کرومی (CROMEV) فرماتے ہیں کہ "میرا یہ عقیدہ ہے کہ ایک ہی جنس کے دو شخص (خواہ وہ دو مرد ہوں یا دو عورتیں) باہم محبت کر سکتے ہیں اور اس محبت کو جنسی تعلق کے ذریعہ سے زیادہ گہرا کر سکتے ہیں۔" نیز ان کا ارشاد ہے کہ "میں کہتا ہوں اگر ایک ہی جنس کے دو شخص ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ذمہ دارانہ تعلقات رکھتے ہوں تو ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس طرح بھی وہ مناسب سمجھیں اس محبت کا عملاً اظہار کریں۔" (ٹائم، فروری ۱۹۶۷ء)

مارکسٹوں کا دعویٰ ہے کہ کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں فیصلہ کن چیز معاشی تقاضے ہیں۔ لیکن یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طبیعتوں کی آوارگی اور مزاجوں کا لا ابالی پن برائیوں کے لیے نت نئے راستے کھولتا رہتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ کے پروٹسٹنٹ پادریوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر انہوں نے مذہبی اصولوں کے تحت اس جرم کی راہ روکنے کی کوشش کی اور عوام کو اس کی اجازت نہ دی تو ان کا مسیحیت سے جو برائے نام رشتہ بھی قائم ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا اور لوگ پھر علانیہ اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں گے۔ لہٰذا جو کچھ لوگ حلال کرنا چاہتے ہیں یا حلال کر چکے ہیں، کلیسا کو بھی اسے حلال کر دینا چاہیے تاکہ لوگ کلیسا سے وابستہ رہ سکیں۔ آپ اس طرزِ استدلال کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ یہ استدلال کتنا غلط اور دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کس قدر تباہ کن ہے اور اسے اختیار کرنے کے بعد کسی مذہب کے اصولوں کی کہاں تک محافظت اور پاسبانی کی جا سکتی ہے۔ جس معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے، جہاں عورتیں عمر بھر شادی کے لیے ترستی رہتی ہیں، اور جو بیچاری اپنی کفالت کی خود ذمہ دار ہوتی ہیں، جہاں بچوں کی پرورش کا بہت سا بوجھ خود حکومت برداشت کرتی ہے وہاں اگر مجرد اخلاقی فساد کے تحت لوگ

غیر فطری افعال کے ارتکاب پر مصر ہوں تو اسے معاشی تقاضا قرار دینا اگر سراسر جہالت نہیں تو اور کیا ہے اور اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسے ظالموں اور فاسقوں کے لیے مذہبی اور قانونی پابندیاں ختم کرنے کی وہ حضرات سفارش کریں جو روحانیت اور اخلاق کے علمبردار ہونے کی وجہ سے معاشرے کی اخلاقی حالت سدھارنے کے براہِ راست ذمّہ دار ہیں۔

پروٹسٹنٹوں کی اس بے راہ روی نے رومن کیتھولک محاذ کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اب انہوں نے بھی شکست خوردہ ذہنیت سے کام لیتے ہوئے مغربی معاشرے کی ہر برائی کے ساتھ مفاہمت کرنی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ضبط ولادت کے معاملہ میں ان کی تازہ ترین شکست ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے کہ رومن کیتھولک کلیسا نے یہ مفاہمت کی روش ایسے مرحلے پر اختیار کی ہے جب "وقتی تقاضوں" کا طلسم کافی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور انسانیت پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ جن رجحانات کو آج وقت کے ناگزیر تقاضے کہہ کر اخلاقی اقدار میں تغیر و تبدل کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ جدید تہذیب کی محض فریب کاریاں ہیں۔ امریکہ میں کیتھولک مذہب کے ماننے والوں کے ان تازہ رجحانات کا ابھی حال ہی میں وہاں کے ایک معروف ہفتہ وار رسالہ میں جائزہ شائع ہوا ہے جو اس کی شہادت فراہم کرتا ہے۔

جو حضرات رومن کیتھولک عقائد سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو پوری طرح جانتے ہیں کہ ان کی رُو سے ضبطِ تولید اور اسقاطِ حمل دونوں افعال یکسر حرام ہیں۔ ایک مدت تک رومن کیتھولک لوگ یورپ اور امریکہ میں رہتے ہوئے اور پروٹسٹنٹوں کے استدلال کو جانتے ہوئے اور مغربی ماحول کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی ان دونوں برائیوں سے مجتنب رہے لیکن جوں جوں ان کے اندر اخلاقی بے راہ روی پیدا ہوتی گئی انہوں نے ان دونوں برائیوں کا ارتکاب شروع کر دیا۔ اس جائزے کے مطابق اب ۳۰ فیصد رومن کیتھولک ضبطِ ولادت کے عملاً قائل ہیں۔ جو لوگ مانع حمل گولیوں یا دوسرے مصنوعی طریقوں سے اولاد کی پیدائش کو روکتے ہیں ان میں ۶۰ فیصد تعداد ان نوجوانوں کی ہے جن

کی عمر ۲۵ سال سے کم ہے۔ اس تعداد کا ۵۴ فیصد کالج کے طالبعلموں اور ۲۴ فیصد ہائی سکول کے طلبا پر مشتمل تھا۔ قریب قریب یہی حال اسقاطِ حمل کا ہے۔

خواب و خیال میں رہنے والے لوگ رومن کیتھولک مذہب کے ماننے والوں میں فکر و عمل کی اس تبدیلی کو بے شک معاشی تقاضوں کا دباؤ قرار دیتے رہیں۔ لیکن جب ہم ان اعداد و شمار پر ذرا گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے پیچھے سوائے ذہنی اور اخلاقی آوارگی کے اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں۔ ضبطِ ولادت کا اہتمام کرنے والوں کی زیادہ تعداد ہائی سکول اور کالج کے طلبا کی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طلبہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ سے لیکر ۲۵ سال کی عمروں کے ہوں گے اور وہ ابھی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہوں گے۔ ان کے ہاں ضبطِ ولادت کا رجحان اور مانع حمل گولیوں کا استعمال اگر اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے نہیں تو آخر کس وجہ سے ہے؟

اور پھر یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے آغاز میں جب مزدوروں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا اور سرمایہ دار انہیں قوتِ لایموت تک فراہم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے اس وقت تو رومن کیتھولک لوگوں نے ان سب دشواریوں اور مشکلات کو بڑی جرأت کے ساتھ برداشت کیا اور ضبطِ ولادت کو حرام سمجھ کر اس سے مکمل اجتناب کرتے رہے مگر اب جبکہ ان مغربی ملکوں میں زندگی کے اوقات کم از کم اتنے تلخ نہیں رہے جتنے صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں تھے، بلکہ اب اُسے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں تو وہ اپنے نزدیک ایک ناجائز بلکہ بالکل حرام فعل کو جائز اور حلال منوانے پر تلا ہوا ہے۔

یہ سب شواہد اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ مغرب میں جن تقاضوں کا ہوا کھڑا کر کے مذہب کے اندر تغیرات لانے کی کوشش کی گئی ان میں سے کوئی ایک تقاضا بھی ایسا نہ تھا جو فی الحقیقت ان تغیرات کا متقاضی تھا۔ اصل میں اہلِ مغرب کی عیش پسندی اور لذت پرستی نے ان کے مزاج کو بگاڑ دیا اور اس کی

خاطر انہوں نے مذہبی بندھنوں کو توڑ کر ہر قسم کی اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ مگر اُن میں چونکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں محض لذتِ نفس کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے وقتی تقاضوں کی آڑ لے کر مذہب کو برباد کیا۔

انسان کی خارجی زندگی ہمیشہ داخلی زندگی کی تابع ہوتی ہے۔ جب انسان اندر سے بدل جائے تو پھر وہ اپنے طرزِ عمل کے لیے وجہِ جواز ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے انہیں عصری تقاضوں کا نام دے کر من مانی کارروائیوں کے لیے زمین تیار کرتا ہے۔ اجتماعی ڈھانچے بلاشبہ بڑے طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں اور یہ کسی قوم کی سیرت و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لیے بڑے مؤثر ہوتے ہیں لیکن یہ ناقابلِ تغیر نہیں ہوتے۔ جب اندر کا انسان انہیں تبدیل کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر یہ بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان کی قوتِ فکر و عمل انہیں جس طرح چاہتی ہے موڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عزم و ہمت رکھنے والے انسان کبھی اُن کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بن کر نہیں رہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ انہیں اپنے افکار و نظریات کے مطابق ڈھالا ہے۔ ان تقاضوں کی ہیبت و جبروت اور ان کے مقابلے میں انسانوں کی بے بسی اور ان کے سانچوں میں ڈھل جانے کے لیے ان کی مجبوری کے وہی لوگ قائل ہوتے ہیں جن کی روح بیمار ہو اور جن کی نفسانی خواہشات ان سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے خود بے تاب ہوں۔ اجتماعی زندگی کا دھارا بے شک بہت بڑی قوت ہے اور یہ انسان کو جس طرف چاہتا ہے فکری و عملی اعتبار سے بہا کر لے جاتا ہے۔ لیکن یہ دھارا کوئی تقدیرِ الٰہی نہیں ہے جس کے رخ کو بدلا نہ جاسکے۔ انسان نے اپنی ہمت سے ان دھاروں کو پہلے بھی اپنے منشا اور مرضی کے مطابق موڑا ہے اور آج بھی وہ انہیں موڑ سکتا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو ان دھاروں کے رُخ پر بہنے کے دل و جان سے خود آرزومند ہوں، ان کے لیے اس چیز کی بے پناہ قوت کے تذکرے واقعی بڑے مفید اور خوش کن ہیں کیونکہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے اُن کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کو تکمیل کا راستہ ملتا ہے۔

پچھلے دنوں عیسائیوں کے ایک مشہور مجلہ "بیداری" (AWAKE) میں گھانا کے سپریم کورٹ کا ایک بڑا اہم فیصلہ شائع ہوا ہے۔ اس فیصلے کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ ایک ہائی سکول کے دو لڑکوں نے اپنے ہیڈ ماسٹر کی حکم عدولی کرتے ہوئے قومی جھنڈے کو سلامی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب اُن سے اس باغیانہ طرزِ عمل کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے صاف کہا:

"ہمارے نزدیک بندگی کا سب سے زیادہ مستحق ہمارا آسمانی خدا ہے اور ہم اسی کے سامنے سرِ نیاز خم کریں گے خواہ اس راہ میں انسان کے خود ساختہ قوانین ہمارے لیے کتنی ہی مشکلات پیدا کریں۔"

ان کے اس جواب کو سن کر ہیڈ ماسٹر سخت مشتعل ہوا اور انہیں دفتر میں بلا کر اس طرزِ عمل کے بارے میں سختی سے باز پرس کی۔ مگر یہ دونوں طلبا اپنے موقف پر قائم رہے۔ ان میں سے ایک نے جس کا نام پال تھا، کہا:

"ہم جھنڈے کو سلامی دینے سے معذور ہیں کیونکہ یہ فعل ہمارے دین کے بنیادی عقیدے سے متصادم ہے اور ہم دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح کی سلامیاں درحقیقت خدائے واحد کی پرستش کے علاوہ کچھ دوسرے خداؤں کی پرستش کے مترادف ہیں۔"

پال کے دوسرے ساتھی اڈمنڈ نے کتاب دانیال کے باب تین میں سے چند آیات اپنے اس موقف کی تائید میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے کوئی انوکھی اور غیر اخلاقی بات نہیں کی۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ دانیال کے تین مقدس رفقاء کار، سدرک، میک اور عبدنجو کی پیروی میں کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب، کیا آپ کو ان تین حضرات کا قصہ یاد نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بائبل سے یہ قصہ خود پڑھ کر سنایا:

"نبوکدنضر بادشاہ نے ایک سونے کی مورت بنوائی جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ تھی اور اُسے دورا ہے کے میدان صوبۂ بابل میں نصب کیا۔ تب نبوکدنضر بادشاہ نے لوگوں کو بھیجا کہ ناظموں اور حاکموں اور سرداروں اور قاضیوں اور خزانچیوں اور مشیروں اور

مفتیوں اور تمام صوبوں کے منصبداروں کو جمع کریں تاکہ وہ اس مورت کی تقدیس پر حاضر ہوں جس کو نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا۔ تب ناظم اور حاکم اور سردار اور قاضی اور خزانچی اور مشیر اور مفتی اور صوبوں کے تمام منصبدار اُس مورت کی تقدیس کے لیے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا جمع ہوئے اور وہ اُس مورت کے سامنے جس کو نبوکدنضر نے نصب کیا تھا، کھڑے ہوئے۔ تب ایک منادی نے بلند آواز سے پکار کر کہا، اے لوگو! اے اُمتو اور اے مختلف زبانیں بولنے والو! تمہارے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اُس سونے کی مورت کے سامنے جس کو نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا ہے گر کر سجدہ کرو اور جو کوئی گر کر سجدہ نہ کرے اُسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالا جائے گا۔ اس لیے جس وقت سب لوگوں نے قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنی تو سب لوگوں نے امتوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں نے اُس مورت کے سامنے جس کو نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا گر کر سجدہ کیا۔ پس اُس وقت چند کسدیوں نے آکر یہودیوں پر الزام لگایا۔ انہوں نے نبوکدنضر بادشاہ سے کہا اے بادشاہ ابدتک جیتا رہ۔ اے بادشاہ تو نے یہ فرمان جاری کیا ہے کہ جو کوئی قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سے گر کر سونے کی مورت کو سجدہ نہ کرے آگ کی جلتی بھٹی میں ڈال دیا جائیگا۔ اب یہ چند یہودی ہیں جن کو تو نے بابل کے صوبہ کی کارپردازی پر متعین کیا ہے یعنی سدرک اور میسک اور عبدنجو۔ ان آدمیوں نے اے بادشاہ تیری تعظیم نہیں کی۔ وہ تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے اور اُس سونے کی مورت کو جسے تو نے نصب کیا ہے سجدہ نہیں کرتے۔ تب نبوکدنضر نے قہر و غضب سے حکم دیا کہ سدرک، میسک اور عبدنجو کو حاضر کریں اور انہوں نے اُن آدمیوں کو بادشاہ کے حضور میں حاضر کیا۔ نبوکدنضر نے اُن سے کہا اے سدرک اور میسک اور عبدنجو، کیا یہ سچ ہے کہ تم میرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہو اور اُس سونے کی مورت کو جسے میں نے نصب کیا ہے

سجدہ نہیں کرتے ؟ اب اگر تم مستعد رہو اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اُس مورت کے سامنے جو مَیں نے بنوائی ہے گر کر سجدہ کرو تو بہتر، پر اگر سجدہ نہ کرو گے تو اُسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالے جاؤ گے اور کونسا معبود تم کو میرے ہاتھ سے چھڑائیگا۔ سدرک اور میسک اور عبد نجو نے بادشاہ سے عرض کی کہ اے نبوکدنضر اس امر میں ہم تجھے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ دیکھ ہمارا خدا جس کی ہم عبادت کرتے ہیں ہم کو آگ کی جلتی بھٹی سے چھڑانے کی قدرت رکھتا ہے، اور اے بادشاہ وہی ہم کو تیرے ہاتھ سے چھڑائے گا۔ اور نہیں تو اے بادشاہ تجھے معلوم ہے کہ ہم تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کریں گے اور اُس سونے کی مورت کو جو تو نے نصب کی ہے سجدہ نہیں کریں گے۔ تب نبوکدنضر قہر سے بھر گیا اور اس کے چہرے کا رنگ سدرک اور میسک اور عبد نجو پر متبدل ہوا اور اس نے حکم دیا کہ بھٹی کی آگ معمول سے سات گنا زیادہ کریں اور اس نے اپنے لشکر کے چند زور آور پہلوانوں کو حکم کیا کہ سدرک اور میسک اور عبدِ نجو کو باندھ کر آگ کی جلتی بھٹی میں ڈال دیں۔ تب یہ مرد اپنے زیر جاموں، قمیصوں اور عماموں سمیت باندھے گئے اور آگ کی جلتی بھٹی میں پھینک دیئے گئے۔" (دانی ایل، باب ۳۔ آیات ۱-۲۲)

ان دونوں بچوں نے ہیڈ ماسٹر کو اس امر کا یقین دلایا کہ انہوں نے یہ طرزِ عمل کسی شوخی، یا گستاخی کے شوق یا جذبۂ بغاوت کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ وہ جھنڈے کی سلامی کو اپنے عقائد کے اعتبار سے بہت بڑی گمراہی خیال کرتے ہیں۔ جھنڈا جو ان کی مملکت کا نشان ہے انہیں اس کا پورا پورا پاس ہے مگر وہ اسے بُت بنا کر کسی صورت بھی اس کی پرستش پر تیار نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے اپنے ہیڈ ماسٹر کی توجہ کتاب خروج باب ۲۰ کی مندرجۂ ذیل آیات کی طرف بھی مبذول کرائی:

"میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔

تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان یا

نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا۔
کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔"

سکول کے ہیڈ ماسٹر نے ایک نہ سنی اور نہ صرف انہیں سکول سے خارج کیا بلکہ انہیں جھنڈے کی توہین کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دیا اور یہ بچے قید کر دیئے گئے۔ ان کے والدین نے رہائی کے لیے تگ و دو شروع کی اور معاملہ عدالت عالیہ میں پیش ہوا۔ وکلائے عدالت پر یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے اپنا سارا زور استدلال صرف کیا کہ ان بچوں کے اس فعل کا محرک قومی نشان کی توہین نہ تھا۔ یہ مذہبی عقائد کا معاملہ ہے اور عوام کو اس بارے میں گھانا کے دستور نے آزادی دے رکھی ہے۔ حکومت کو مذہبی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر اس مقدمے کے سب سے بڑے گواہ تھے۔ انہیں عدالت میں طلب کیا گیا اور اُن سے مختلف سوالات پوچھے گئے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ اگرچہ دینِ مسیحی کے سچے پیرو ہیں اور اس کے احکام کو مانتے ہیں۔ لیکن وہ پارلیمنٹ کے قوانین کو مذہبی احکام پر ترجیح دیں گے۔ انہوں نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا:

"میں بلا شبہ مسیحی ہوں اور کئی اعتبارات سے ایک اچھا مسیحی ہوں۔ میں دس احکام کو بھی دل و جان سے مانتا ہوں اور اُن پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اگر گھانا کی پارلیمنٹ مجھے یہ حکم دے کہ جو لڑکا تمہارے پاؤں پر قدم رکھے اُسے ہلاک کر دو تو میں دس احکام کو پوری طرح پیشِ نظر رکھنے اور اُن کی اہمیت محسوس کرنے کے باوجود اُسے بلا تامل قتل کر دونگا۔"

عدالت نے بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کے موقف کی تائید کی اور بچوں کی سزاؤں کی توثیق کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا:

"مجرم بلا شبہ کم عمر اور مڈل سکول کے طلبہ ہیں۔ اس نوعمری میں انہیں اس بات کی اجازت نہ دینی چاہیے کہ وہ مذہبی احساسات اور اصولوں سے مغلوب ہو کر گھانا کے قوانین کو توڑنے کی جسارت کریں۔"

اس سزا کے بعد بچوں کو بورسٹل جیل بھیج دیا گیا اور وہاں ماہرین نفسیات کو اس بات پر مامور کیا گیا

کہ وہ ان کا جائزہ لے کر بتائیں کہ آخر ان کے دماغ میں کیا خرابی ہوئی ہے کہ ان بچوں نے ملکی قانون توڑنے کی جسارت کی۔ لیکن معلوم ہُوا کہ یہ بچے کسی ذہنی عارضے میں مبتلا نہیں۔ ان کی دماغی کیفیت بالکل ٹھیک اور درست ہے اور انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی جذباتی پن کی وجہ سے نہیں بالکل سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان بچوں کا جیل میں طرزِ عمل بڑا اچھا اور قابلِ ستائش تھا اور انہوں نے جلد ہی وہاں اپنے لیے عزت و احترام کا اونچا مقام پیدا کر لیا۔ کچھ مدت کے بعد انہوں نے انصاف کے لیے عدالتِ عظمیٰ کی طرف رجوع کیا اور وہاں سے یہ دونوں بچے اس بنا پر رہا کر دیئے گئے کہ حکومت کو مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں۔

عدالتِ عظمیٰ نے اگرچہ معاملے کو سادہ صورت دے کر بچوں کی رہائی کے احکام صادر کر دیئے مگر یہ معاملہ فی الحقیقت اتنا سادہ نہیں جتنا کہ جج صاحبان نے فیصلہ دیتے وقت اسے سمجھ لیا تھا۔ یہ تاریخ، تمدن، معاشرت بلکہ انسانیت کا ایک بنیادی اور اساسی معاملہ ہے کہ کیا خدا کے علاوہ کسی دوسری ہستی کو، خواہ وہ حکومت و مملکت ہو یا مطلق العنان بادشاہت یا مذہبی اجارہ داریاں، یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قوانینِ الٰہی کے مقابلے میں اپنے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کی بالادستی قائم کریں۔ جس فعل کو ہم پرستش اور عبادت کہتے ہیں وہ محض چند الفاظ کی زبان سے ادائیگی یا چند حرکات کا نام نہیں بلکہ یہ خدائے واحد کے سامنے اس واضح حقیقت کا اظہار ہے کہ ہم اس کے مقابلے میں کسی دوسرے فرد یا ادارے کو خواہ وہ کتنا ہی باجبروت اور مقدس ہو، واجب الاطاعت نہیں سمجھتے اور اس کے احکام کے سامنے کسی دوسرے کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

قوانینِ ربانی اور چالاک اور عیار لوگوں نے اپنی خدائی قائم کرنے کے لیے جو قوانین وضع کر رکھے ہیں ان کے درمیان تصادم بالکل فطری ہے۔ اسلام میں تو شریعت اور قوانین کے درمیان قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے، کیونکہ اسلام دین کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے جس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ بلکہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ بھی اس کے قوانین کے تسلط سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ لیکن وہ

دین کا جامع تصوّر[1]

سیّد قُطب شہید

(ترجمہ: عبدالحمید صدیقی)

دین اور دنیا کی دوئی کا تصور یکسر غلط اور باطل ہے۔ دینِ حق انسانی زندگی کا ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس بنا پر وہ کبھی اپنے دائرۂ کار کو محض وجدانی کیفیات، بے جان اخلاقی ضابطوں، مذہبی رسوم، گیان دھیان کی مختلف ریاضتوں اور طور طریقوں تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ وہ کیسے زندگی کے محض ایک گوشے میں سمٹ کر رہ سکتا ہے جسے آج کل کی مذہبی اصطلاح میں ایک شخصی معاملہ کہا جاتا ہے؟ دینِ حق یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ باری تعالیٰ کو حیاتِ بشری کے ایک نہایت ہی کمزور حصے کا حاکم مانا جائے اور باقی زندگی چھوٹے خداؤں کی سرپرستی میں بسر کی جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہونگے کہ انفرادی زندگی میں تو انسان خدا کے بتاتے ہوئے اخلاقی ضابطوں کا پابند ہو مگر اجتماعی زندگی میں وہ یا تو خود اپنی خواہشات کی پیروی کرے یا انسانوں کے وضع کیے ہوئے اصولوں کو اپنائے۔ پھر یہ بات بھی اسلام کے تصورِ دین کے خلاف

---

[1] یہ مضمون سید قطب شہیدؒ کی ایک معروف کتاب المستقبل لھٰذا الدین کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ ادارہ معارفِ اسلامی، کراچی شائع کر رہا ہے۔

(بقیّہ اشارات)

۵۔ قومیں جنہوں نے حیاتِ انسانی کا بٹوارہ کر کے اُس کے کچھ حصے قیصر کو اور کچھ خدا کو دے دیئے ہیں۔ انہیں بھی سوچنا چاہیے کہ کیا یہ تقسیم غلط اور غیر فطری تو نہیں۔ اور کیا جن حصوں کو وہ قیصر کے حصے سمجھ کر اُن پر انسانوں کے قوانین نافذ کر رہے ہیں وہ خدا کی خدائی کی تکذیب اور اُس کے حقوق پر ڈاکہ تو نہیں۔

ہے کہ وہ انسان کو اُخروی فلاح کا راستہ تو بتاسکے مگر اس دنیا کے لیے اُسے کوئی رہنمائی نہ دے اور لوگ خلافتِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے یکسر بے پروا ہو کر امورِ دنیا کو جس نہج پر چاہیں چلاتے رہیں۔ دین کی یہ کمزور حیثیت یوں بھی خلافِ عقل ہے۔ لیکن اسلام جو اللہ کا سچا دین ہے وہ تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پست حیثیت کو گوارا نہیں کرسکتا۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ دین کس طرح دنیاوی معاملات سے بے تعلق ہوتا گیا۔

دین اور دنیا کی تفریق کا نظریہ یورپ سے دنیا کی دوسری قوموں کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اس باطل نظریے نے اہلِ یورپ کی بلکہ پوری انسانیت کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ یہ نظریہ دفعتاً ابھر کر سامنے نہیں آیا بلکہ تاریخ کے ایک لمبے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی رہنمائی و ہدایت کے لیے انبیاء بھی مبعوث فرمائے، اور انہیں کتبِ سماوی سے بھی نوازا۔ بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے خالقِ کائنات نے بکثرت پیغمبر بھیجے جنہوں نے انہیں حق اور صداقت کی راہ دکھانے کی پوری پوری کوشش کی مگر انہوں نے دھڑے بندیوں اور تعصبات میں گرفتار ہو کر اُن کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا مذہبی پندار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ان کے پاس جب حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر گئے تو وہ محض اس بنا پر ان کے دشمن بن گئے کہ انہوں نے اُن کی غلط روش پر انہیں ٹوکا۔ قرآن مجید حضرت مسیح کے پیغام اور دعوت کو یوں بیان کرتا ہے:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۔ (آل عمران۔ ۵۰)

اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔[۱]

---

[۱] ہر نئے نبی کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام بھی پچھلے انبیاء کی تردید و تغلیط نہیں کر رہے بلکہ حضرت موسیٰ اور ان کی شریعت کی تائید و توثیق کر رہے ہیں اور یہودیوں کو بتا رہے ہیں کہ میں شریعتِ موسوی کو مٹانے کے لیے نہیں آیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ خود کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ انہیں شریعتِ موسوی

بلکہ اُس کی تجدید کے لیے آیا ہوں ۔اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں بھی موجود ہیں ۔مثلاً حضرت عیسیٰ کے یہ ارشادات ملاحظہ ہوں :

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں ، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پُورا کرنے آیا ہوں "۔ (متی ۵ - ۱۷)

"آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطے کے مٹ جانے سے آسان ہے "۔ (لوقا ۱۶ : ۱۷)

انجیلی زبان میں شریعت سے مراد شریعتِ موسوی ہی ہے ۔

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیح سے پوچھا کہ احکامِ دین میں اولین حکم کونسا ہے ۔جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا :

"خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ ۔بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ ۔انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" (متی ۲۲ : ۳۷ - ۴۰)

قرآن مجید اور انجیل کی مندرجۂ بالا تصریحات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر تشریف نہ لائے تھے بلکہ اُن کا کام شریعتِ موسوی کی تجدید تھا ۔اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ناروا پابندیاں اور قیود تمہارے علماء نے اپنی طرف سے تم پر عائد کر رکھی ہیں اُن کا بوجھ ہلکا کرنا میرے فرائضِ رسالت میں داخل ہے ۔چنانچہ انجیل میں حضرت عیسیٰ کا ارشاد ہے :

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دونگا ۔میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن ۔

کی تجدید کی ذمہ داری ہی سونپی گئی تھی اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی کہ لوگوں کے اندر روح کی پاکیزگی، تقویٰ اور طہارت پیدا ہو۔ عبادات کے خارجی مظاہر پر زور دینے کے بجائے سیدنا مسیح علیہ السلام نے تعلق باللہ پر زور دیا۔ ان کے مقابلے میں یہودیوں کے نزدیک اصل اہمیت مذہب کے ظاہری اعمال اور مذہبی رسوم و قیود کو حاصل تھی۔ اور ان اعمال کی روح سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اس طرح یہودیوں اور مسیحیت کے علمبرداروں کے مابین آویزش نے جنم لیا۔ اس کشمکش نے بالآخر یہ خوفناک صورت اختیار کی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سُولی پر چڑھانے کے منصوبے تیار ہوئے مگر باری تعالیٰ نے یہودیوں کے ان ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ یہودیوں کی اس شرارت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی محبت کا دم بھرنے والوں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے پیرؤوں کے درمیان منافرت اور کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور ان دونوں نے ایک دوسرے سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ تعلقات کی یہ کشیدگی مذہب پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں نے اپنی کتاب انجیل کو بھی دوسری کتبِ مقدسہ سے الگ کر کے صرف اس کی پیروی پر اکتفا کیا اور باقی کتب کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ وہ ان کو پڑھتے ضرور ہیں مگر ان کے

۳۔ تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جوا نرم ہے اور میرا بوجھ ہلکا ہے"۔ (متی ۱۱: ۲۹-۳۰)

جس امر کی طرف سید قطب شہیدؒ نے سرسری اشارہ کیا ہے اُسے میں نے قدرے صراحت کے ساتھ اس لیے بیان کیا ہے کہ یہ نکتہ اُن کی ساری بحث کا مدار ہے۔ وہ دراصل ثابت یہ کر رہے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں دین اور دنیا کی تفریق کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ شریعتِ موسوی کے ہی پیرو اور مجدد تھے، مگر جب یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان دشمنی شدت اختیار کر گئی تو نصرانیوں نے شریعتِ موسوی کو "لعنت" قرار دے کر چھوڑ دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امورِ دنیا کے متعلق عیسائیوں کے پاس سرے سے کوئی آسمانی ضابطۂ اخلاق باقی نہ رہا اور عیسائیت بندے اور خالق کے درمیان محض ایک نجی تعلق بن کر رہ گئی (مترجم)،

لے حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ شریعت موسوی اپنی جگہ پر موجود ہونے کے باوجود یہودیوں کی زندگی پر کوئی پاکیزہ اثر مترتب نہیں کر رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کے دلوں سے محبت الٰہی ختم ہو گئی تھی اور وہ باطنی پاکیزگی جاتی رہی تھی جو کسی شریعت کی پیروی کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنا سارا زور لوگوں کے اندر یہی چیز پیدا کرنے پر صرف کیا۔ (مترجم)

کسی حکم کی پیروی نہیں کرتے، نہ ہدایت کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں کو سخت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی اسرائیل کی پوری شریعت تورات ہی میں موجود ہے اور اس کی تجدید کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اب جبکہ دینِ مسیحی کے علمبرداروں نے شریعت موسوی کا مقاطعہ کیا تو اُن کے پاس ایسی کوئی شریعت باقی نہ رہی جو تعلق باللہ کی اساس پر اُن کی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل کرتی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ وہ اعتقادی تصورات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے وہ بھی بدقسمتی سے جوں کے توں محفوظ نہ رہ سکے۔ اگر وہی زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ جاتے تو کم از کم ایک ایسا نظامِ فکر تو معرضِ وجود میں آتا جس میں اِس کائنات کے اندر انسان کے مرتبہ و مقام کو مشخص اور اُس کی زندگی کے مقاصد کو متعین کیا جا سکتا تھا اور اس طرح اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے کوئی صحیح بنیاد فراہم ہو سکتی۔ نیز اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ عیسائیوں کے اہلِ علم خدائی ہدایت کی ضرورت محسوس کر کے شریعتِ موسوی کی طرف پھر رجوع کرتے اور علماء یہود کی خود ساختہ پابندیوں سے الگ کر کے اصل شریعت کے احکام اس میں سے چھانٹ لیتے۔ مگر اس کے برعکس عالمِ واقعات میں ہوا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو یہودیوں اور رومی بُت پرستوں کے ہاتھوں شدید مصائب اٹھانے پڑے اور وہ بیچارے اس بات پر مجبور ہوئے کہ دعوتِ دین کا کام چھپ چھپا کر ان ظالموں کی نظروں سے بچتے ہوئے کریں۔ ان سنگین اور نامساعد حالات میں انہوں نے انجیل کی بعض نصوص اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی میں بعض تبدیلیاں کر دیں اور تبدیلی کا یہ عمل اِس تواتر کے ساتھ جاری رہا کہ تعلیماتِ ربّانی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ذاتی تاثرات اور خیالات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ اب ان میں تمیز کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ پھر راویوں کے اختلاف کی وجہ سے انجیل کے مندرجات میں بھی اختلاف رونما ہوا، اور اس طرح متعدد اناجیل معرضِ وجود میں آئیں۔ ان اناجیل کی حیثیت کتبِ سماوی کی نہیں بلکہ روایات کے دفاتر کی سی ہے جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے افکار و اعمال کو قلمبند کیا گیا ہے۔

یورپ میں مسیحیت پولوس (سینٹ پال) کے ذریعہ پہنچی۔ یہ شخص مسیحیت کا حلقہ بگوش بننے سے پہلے

بت پرست تھا۔ اسے نہ تو حضرت مسیح کی صحبت نصیب ہوئی اور نہ اس نے اُن کی تعلیمات کو جاننے کی کوشش کی۔ اس نے رومی بت پرستی کے بہت سے غلط تصورات کو دین مسیحی میں شامل کر کے یورپ میں اُن کا پرچار شروع کر دیا۔ عیسائیت کی یہ دوسری بدنصیبی تھی کہ اُسے پولوس کی ذات میں ایک ایسا مبلغ ملا جو نہ تو مسیحی تعلیمات سے پوری طرح واقف تھا اور نہ دینی جذبہ و احساس کے اعتبار سے مخلص تھا۔ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے تقریباً سو سال بعد کئی ایک رسائل لکھے جن میں مذہبی معتقدات کے اندر فلسفیانہ موشگافیاں پیدا کرنے کے ڈھنگ بنائے گئے تھے اور اُن کا عملی مظاہرہ بھی موجود تھا خصوصاً مسئلہ حلول کا تو یہ شخص زبردست داعی اور مبلغ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مسیح خدا کے بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے بھلائی کے طلبگاروں کو اس کی عام طور پر یہ نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ کلمۃ اللہ کو اپنے اندر جذب کریں اور بخشش کے لیے اُس کی طرف رجوع کریں۔ وہ عوام کو انبیاء کی طرح بشارتیں دیتا اور کہتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام جلد ہی جب واپس آئیں گے تو وہ انہیں غیر معمولی عزو شرف سے بہرہ ور کریں گے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو "ہمارا خداوند یسوع مسیح" کہہ کر پکارتا اور اپنے آپ کو "رسول یسوع مسیح" کے معزز لقب سے ملقب کرتا۔

پولوس کی دعوت جب پھیلنے لگی تو لوگ غلطی سے اسے عیسائیت کی کامیابی و کامرانی سمجھ کر خوش ہوئے۔ پھر جب رومی شہنشاہ قسطنطین نے دینِ مسیحی کو قبول کیا تو عوام کے اندر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے یہ سمجھا کہ اب عیسائیت ایک حکمران طاقت بننے کی وجہ سے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کرے گی ایک امریکی مفکر اپنی کتاب "دین اور علم" میں اسی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

"منافقین کے اثرو رسوخ کی وجہ سے مسیحیت کے اندر شرک اور بت پرستی کے جراثیم داخل ہو گئے۔ یہ منافقین رومی حکومت کے بڑے بلند مناصب پر فائز ہونے والے اور خطیر معاوضے پانے والے عہدیدار تھے۔ بظاہر تو یہ مسیحیت کی محبت کا دم بھرتے تھے مگر ان سے اس دین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی دین سے ناواقفیت تھی اور دوسری وجہ ان کی منافقت۔ انہیں دینِ حق کے ساتھ مخلصانہ تعلق نہ تھا۔ خود قسطنطین اس جہالت اور منافقت کا پیکر تھا۔ اس کی پوری عمر ظلم اور فسق و فجور میں گزری اور عمر کے آخری چند برسوں کے سوا اُس نے

احکام دین کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس نئے دور میں ملّتِ مسیحی بظاہر بڑی طاقتور نظر آرہی تھی، کیونکہ بادشاہ قسطنطین اس کی غلامی کا دعویدار تھا، مگر درحقیقت اس کے اندر زبردست اضمحلال پیدا ہوچکا تھا اور اس بنا پر یہ بت پرستی کا قلع قمع کرنے اور شرک کے جراثیم برباد کرنے میں سخت ناکام رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فروعات تو ایک طرف رہیں، اس کے معتقدات اور بنیادی تصورات تک میں باطل کی آمیزش ہوگئی اور اس طرح مذہب کا ایک ایسا ملغوبہ تیار ہوا جس میں عیسائیت اور بت پرستی کے اجزا شامل تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور عیسائیت کے درمیان بُعد و بیگانگی شروع ہوتی ہے۔ اسلام شرک اور بت پرستی کا دشمن ہے۔

یہ فرمانروا قسطنطین جو خالص دنیا پرست تھا، جو ہر معاملے کو ذاتی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی تھا، اُس کی نظر میں دینی عقائد کی آخر کیا اہمیت اور ان کا کیا وزن ہوسکتا تھا۔ اُس نے ذاتی مفادات کے لیے دو متحارب گروہوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے متبعین اور بت پرستوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اُس دور کے مخلصین اور دین سے گہری محبت رکھنے والوں نے اس غلط روش پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اُن کا یہ خیال تھا کہ دین کا یہ نیا مرکب چونکہ فطری طور پر غلط ہے اس لیے یہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو جائے گا اور بت پرستانہ عقائد و نظریات خود بخود مٹتے چلے جائیں گے اور اس طرح دین پاک اور منزّہ ہوکر انسانوں کی رہنمائی کے لیے زندہ رہ جائے گا۔ مگر افسوس کہ مقدس مذہبی گروہ کی یہ توقعات توقعات ہی رہیں، شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں۔ دینِ حق شرک اور بت پرستی کی آلائشوں سے پاک نہ ہو سکا۔ توحید اور بت پرستی کی آمیزش میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور بعد میں مسیحی معتقدات اور تصورات پر سیاسی آویزش کی بھیانک پرچھائیاں پڑنے لگیں۔"

توحید اور بت پرستی کی اس آمیزش کو مذہبی لحاظ سے کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دینی عقائد و نظریات کی کوئی ایسی تفسیر و تعبیر کی جائے جو مختلف اور متخالف گروہوں اور قوموں کے لیے قابلِ قبول ہو، جو کیتھولکس کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ذہنی اطمینان کا باعث بن سکے۔ اس غرض کے لیے

۴۵۱ء میں خلقدونیہ (CHALCEDON) کے مقام پر عیسائیوں کا ایک زبردست اجتماع ہُوا جس میں مسیح کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا کہ وہ کئی مختلف اور متضاد صفات کے جامع ہیں اور یہ صفات اپنی پُوری خصوصیات کے ساتھ اُن کی ذات کے اندر جمع ہیں۔ وہ الوہیت، بشریت اور روح کے مظہر ہیں اور اس طرح بیٹا، باپ اور روح القدس ایک ہی جسد میں جلوہ گر ہیں۔ اقانیم ثلاثہ کا تصور توحید پرستی اور بت پرستی کی آمیزش کی علامت ہے۔

فرقہ یعقوبیہ نے اس اعلان سے شدید اختلاف کیا۔ یہ گروہ ایک ذات کے اندر تین مختلف اور متضاد صفات کی یکجائی کا قائل نہ تھا۔ بلکہ اس ذات کو تین اقانیم کا مرکب و مجموعہ سمجھتا تھا۔ یہ اختلاف کافی مدت تک چلتا رہا۔ یعقوبی گروہ مصر و شام اور رومی سلطنت کے دُور دراز گوشوں میں کافی زور پکڑ چکا تھا۔ ہرقل نے ان کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کے لیے یہ نیا تصور دیا کہ مسیح ایک ہی طرح کی مشیت کا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جسدِ واحد کے اندر اگرچہ رجحانات مختلف اور متضاد ہیں مگر ان کے پیچھے ایک ہی ارادہ کار فرما ہے۔ ہرقل کی یہ تصریح جو مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان مفاہمت کی غرض سے پیش کی گئی تھی کامیاب نہ ہوسکی اور اس پر ہر گروہ نے اظہارِ اطمینان کرنے کے بجائے اسے موردِ الزام ٹھہرایا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات ستودہ صفات کے بارے میں یہ مختلف من گھڑت تصورات جو موحدین اور بت پرستوں کے دو متضاد خیال گروہوں کے درمیان مصالحت کی غرض سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے مسیحیت کے لیے بڑے تباہ کُن ثابت ہوتے۔ انہوں نے دینِ مسیحی کو صحیح اور غلط تصورات کا ایک ایسا ملغوبہ بنا دیا جس کے صحیح اجزا کو باطل سے الگ نہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک الہامی مذہب سے بدل کر عجیب و غریب اور پیچیدہ افکار و نظریات کا محض ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا تھا جس سے عوام کو دھوکے تو دیے جاسکتے تھے مگر حق و صداقت کی راہ منور نہ کی جاسکتی تھی۔ اس دین میں اب وہ صلاحیت ہی باقی نہ رہی تھی جس سے خدا کے وجود کا صحیح تصور پیش کیا جاسکتا، خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی صحیح نوعیت معلوم کی جاسکتی، یا صفاتِ الٰہی کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگایا جاسکتا، یا اس کی طرف رجوع کرکے یہ معلوم ہوسکتا کہ وجودِ انسانی کی حقیقت کیا ہے اس وجود کو کس مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک انسانی فطرت کے ان بنیادی اور اساسی سوالات کا ٹھیک جواب نہیں دے لیتے کسی کامیاب متوازن اور منظم اجتماعی زندگی کی تشکیل ممکن نہیں ہوسکتی۔

پاکستان کے معاشرتی و سیاسی نظام میں

اسلامی قانون کا منصب و مقام

(جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس، سابق جج سپریم کورٹ آف پاکستان)

پاکستان کی سیاسی و معاشی و معاشرتی تنظیم میں اسلامی قانون کے کردار کو بیان کرنے کے لیے بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اسلامی قانون کا نفاذ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کا موجب ہو گا۔ اس کے بعد ہمیں صرف اس امر کا تعین کرنا ہو گا کہ اسلامی ریاست کے مفہوم میں کیا کچھ شامل ہے اور اس کے مضمرات کیا ہیں۔

مقصدِ حیات یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کا لازمی نتیجہ اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ اسلامی قانون یا دوسرے الفاظ میں قانونِ شریعت انسانی کردار کے لیے محض چند اخلاقی اصول و ضوابط بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ وہ سب سے پہلے انسانی زندگی کا ایک مقصد متعین کرتا ہے اور وہ ہے خدا کی اطاعت۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات۔ ۵۶) "میں نے جن و انس کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں" انسان کے ماسوا کائنات کی جملہ مخلوق ہر حال میں خدا کی اطاعت اور بندگی بجا لاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ انسان کو ایک محدود دائرے کے اندر آزادیٔ عمل عطا کی گئی ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس دائرے میں انسان اپنی آزاد مرضی سے اس کی اطاعت کرے۔

اسلامی ریاست کا قیام ایک دینی فریضہ مقصدِ حیات کے تعین کے بعد شریعتِ الٰہی اس مقصد کے حصول کی خاطر ایک مثالی اجتماعی نظام برپا کرتی ہے۔ اس کے لیے وہ ایسے اصولوں اور ایسے دیوانی، تعزیراتی اور مالی قوانین کا ایک ڈھانچہ قائم کرتی ہے جو قابلِ ترمیم و تنسیخ نہیں ہیں۔ اس ڈھانچے کے حدود

میں رہتے ہوئے انسانی ذہن اپنے حالات کے مطابق قواعد و قوانین وضع کر سکتا ہے۔ یہ شریعت مسلمانوں پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور پھر ان امرائے ریاست کی اطاعت واجب قرار دیتی ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں، بشرطیکہ اُن کی اطاعت سے اللہ و رسول کی نافرمانی لازم نہ آئے۔ قرآن مجید یہ طے کرتا ہے کہ مسلمان وہ لوگ ہیں:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (الحج ۔ ۴۱)

جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرینگے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا قیام لازم و ناگزیر ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان اللہ یزع بالسلطان ما لا یزع بالقرآن۔

اللہ تعالیٰ ریاست کے زور سے ان چیزوں کی روک تھام کرتا ہے جن کا سدباب محض قرآن کے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔

قرآن کی رُو سے حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (الانعام ۔ ۵۸)

حکم کا اختیار صرف اللہ کے لیے ہے

یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ۔ (آل عمران ۔ ۱۵۳)

کہتے ہیں، کیا اس امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے کہہ دو، امر و اقتدار درحقیقت سارا کا سارا اللہ کے لیے ہے۔

اسی طرح کا مضمون سورہ یوسف، ۵۶ ۔ الانعام، ۵۷ ۔ الاعراف، ۵۴ ۔ اور النحل، ۱۱۶ میں بھی بیان ہوا ہے۔ ایک شخص یہ گمان کر سکتا تھا کہ اللہ کی جس حاکمیت کا ذکر ان آیات میں ہے اس سے مراد اللہ کے وہ تکوینی قوانین ہیں جو کائنات میں کارفرما ہیں۔ لیکن اس شُبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں دیوانی، فوجداری اور مالی قوانین کا ذکر موجود ہے اور قرآن میں ایسی آیات بھی پائی جاتی ہیں جن میں حکمرانوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق کریں۔ اس کا

صاف مطلب یہ ہے کہ حاکمیتِ الٰہی کا واضح اور براہِ راست تعلق ریاست و سیاست سے بھی ہے۔ سورۂ مائدہ میں بعض تعزیری قوانین بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۴-۴۵-۴۷)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (احکام) کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں، ... وہی ظالم ہیں ... وہی فاسق ہیں۔

قرآن مجید بار بار اُن افراد کو مخاطب کرتا ہے جنہیں ریاست میں اقتدار حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی بالعموم اِس مفروضہ مسئلہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک ریاست موجود ہوگی جس میں شریعت نافذ العمل ہوگی۔ اللہ نے اپنے رسول کو ایک ریاست کے قیام کا مکلف بنایا تھا اور آپ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ امیر و حکمران بھی تھے۔

اوپر کی بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایک مسلم معاشرے کی معمولی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے اندر احکامِ شریعت کو بالکلیہ جاری کرے اور عملی جامہ پہنائے۔ اس لحاظ سے جہاں مسلمانوں کو آزادی و اقتدار حاصل ہو وہاں اسلامی ریاست برپا کرنا اُن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں سے یہ چاہنا کہ وہ اسلامی ریاست قائم کرنے سے باز رہیں، دوسرے لفظوں میں گویا ان سے یہ چاہنا ہے کہ وہ مسلمان بن کر نہ رہیں۔ اس معاملہ میں کسی بحث کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بلاشبہ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ایک لادینی (سیکولر) ریاست راتوں رات ایک اسلامی ریاست میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ تبدیلی کے لیے بہرحال تدریج ناگزیر ہے، ورنہ سماجی زندگی درہم برہم ہو جانے کا خدشہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسلامی ریاست کے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کئی سال لگ گئے تھے۔

اسلامی ریاست کے بنیادی تصورات | اسلامی ریاست کے لزوم و وجوب کو واضح کرنے کے بعد اب ہم اس مسئلے کی جانب متوجہ ہوتے ہیں کہ اس کے مضمرات کیا ہیں۔ جن بنیادی تصورات پر ریاست قائم ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

(۱) حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔ انسانی کردار کی صحت کا معیار یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے

مطابق ہو، اور اللہ کی رضا کے معلوم کرنے کا ذریعہ اسلامی شریعت ہے۔

(۲) انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔

(۳) اسلامی ریاست کے وجود کی اصل غرض وغایت یہ ہے کہ وہ زندگی کے مقصدِ حقیقی کو پہنچنے میں مددگار ہو، اور وہ مقصد ہے اللہ کی عبودیت اور اطاعت۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امرائے ریاست اطاعت فی المعروف کے حقدار ہیں

(۵) معاملات کے فیصلے باہمی مشورے سے ہونے چاہییں، اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (وہ مسائل کو مشورے سے طے کرتے ہیں) الشوریٰ، ۳۸۔

(۶) وسیع تر انسانی برادری کے اندر مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اسلامی ریاست اور لادینی ریاست کا فرق اسلامی ریاست اور لادینی (سیکولر) ریاست ایک دوسری سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنا کہ اسلامی طرز حیات مغرب کے طرز حیات سے مختلف ہے۔ سیکولر ریاست درحقیقت مغربی تہذیب کا ثمرہ ہے اور مغربی تہذیب سے میری مراد ایسا طرز زندگی ہے جو دین مسیحی پر مبنی ہو کیونکہ مغربی تہذیب کی اساس مذہبی تعلیمات پر نہیں رکھی گئی ہے! اسلامی طریق حیات اور مغربی طریقِ حیات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کا مطلب خدا کی بندگی ہے اور دوسرے کا مطلب خواہش کی بندگی۔ ہمارا الٰہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور تہذیبِ حاضر کے پرستار اس ارشادِ الٰہی کے مصداق ہیں:

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (الجاثیہ: ۲۳)	کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہی میں پھینک دیا ہے۔

مغربی تہذیب کی رُو سے انسانی مساعی کا مدعا مادہ پرستانہ مقاصد کا حصول اور خواہشات کی تسکین ہے۔ اس تہذیب میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدر بس یہی ہے۔ جن اخلاقی ضوابط کو یہ تہذیب تسلیم کرتی ہے ان میں خواہشاتِ نفس سے بالاتر کسی شئے کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس کے تمام تر قواعد

ضوابط خواہشِ نفس کی تکمیل ہی کے لیے ہیں۔ یہ قواعد ایسے ہیں جن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خواہشات کی تحصیل میں انسانیت کو زیادہ سے زیادہ کامیابی سے ہم کنار کریں گے۔

اسلامی ریاست کے تصوّر کے خلاف بار بار یہ الزام لگا کر حملے کیے جاتے ہیں کہ یہ رجعت پسند آتھیا کریسی ہے جو قرونِ وسطیٰ کی یادگار ہے اور اس میں شہریوں کے درمیان مذہب پر مبنی ایک ناروا امتیاز برتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس معترض حضرات سیکولرزم کو ریاست کے عزو شرف کی ایک علامت قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ایک شخص اسلامی ریاست اور سیکولر اسٹیٹ کے اساسی نظریات کا تقابل کرتا ہے تو وہ اس طرح کے حملوں پر اظہارِ حیرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تہذیبِ جدید کی تہ میں جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے اور جس تصوّر سے یہ تہذیب وجود میں آئی ہے اسے میں ابھی ابھی بیان کر چکا ہوں۔ مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات کو جب مذہب اور روایتی متوارث اخلاقیات سے منقطع اور علیحدہ کر دیا جاتا ہے تو عمل کے لیے کوئی اعلیٰ و ارفع محرک باقی نہیں رہتا۔ اِس تہذیب نے انسان کا رشتہ اُس خدا سے تو کاٹ دیا جو اس کے لیے خیر و شر کا معیار مقرر کرتا تھا مگر وہ اس کا کوئی بدل فراہم نہ کر سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ سفینۂ حیات کے لیے کوئی لنگر باقی نہ رہا۔ جن فلسفیانہ اور نفسیاتی نظریات کا اس تہذیب پر بڑا تسلط ہے، اُنہوں نے ہر اس بنیاد کو منہدم کر دیا ہے جو انسان کو اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز کا لحاظ کر کے ضبطِ نفس پر آمادہ کر سکتی تھی۔ ان نظریات کی رُو سے زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ انسان محض کسی اتفاقی حادثے کی پیداوار ہے، جو عین ممکن ہے کہ کبھی ظہور پذیر ہی نہ ہوتا۔

نفسیات میں سُلُوکیت (BEHAVIORISM) اور تحلیلِ نفسی (PSYCHO-ANALYSIS) کی رُو سے انسان اپنے افعال کا سرے سے ذمہ دار ہی نہیں ہے۔ ایک کے نزدیک انسانی افعال محض طبیعی محرکات کے اضطراری ردِ عمل ہیں اور دوسرے کے نزدیک وہ انسانی ذہن کی بعض ایسی نیم شعوری یا غیر شعوری کیفیات کا نتیجہ ہیں جن پر انسان کو کوئی اختیار اور قدرت حاصل نہیں ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں، تحلیلِ نفسی کا فن ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے۔ وہ نفسانی خواہشات کی تسکین کو صرف جائز اور حق بجانب ہی قرار نہیں دیتا، بلکہ وہ یہ سبق بھی پڑھاتا ہے کہ ہر خواہش کی تسکین واجب اور ناگزیر ہے، کیونکہ اگر اس کی تسکین

نہ کی گئی تو انسان کے ذہن میں الجھنیں (COMPLEXES) پڑ جاتی ہیں اور وہ ایک غیر صحت مندانہ کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان نظریات کی روشنی میں بہترین بشری اوصاف مثلاً شجاعت، شرافت، حیاداری، مروت، ایثار اور طہارتِ افکار، سب کے سب اپنی اہمیت و معنویت کھو دیتے ہیں، کیونکہ وہ بعض طبعی اور نفسیاتی عوامل کا ایک اضطراری ثمرہ قرار پاتے ہیں جن میں انسانی کوشش کو دخل نہیں۔

اس طرح کے فلسفۂ زندگی کا جو اثر انسانی سیرت و کردار پر مترتب ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ریاست کے معاملات کا اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ ریاست کی کسی کارروائی کے لیے بس قومی مفاد ہی ایک معیارِ صحت ہے۔ ریاست کے اقتدار و اختیار پر کوئی حد بندی تسلیم نہیں کی جا سکتی حتیٰ کہ وہ کسی عہد و پیمان کی بھی پابند نہیں ہے کیونکہ وہ بالاتر حاکمیت کی حامل ہے اور اس کے حدود کار پر کوئی رکاوٹ عائد ہونا حاکمیت کے منافی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ان کے کردار کا معاملہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جو شے انسان کے لیے خوش کن اور مسرت انگیز ہے وہی خیر اور وہی نیکی ہے، تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے انسان کی مسرت میں خلل انداز نہ ہو۔ گناہ و صواب کی تمیز اور روایتی تصورِ اخلاق کو خیرباد کہا جا چکا ہے اور اخلاق میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ صرف منفعت پرستانہ تصورِ اخلاق ہے۔ ایک آدمی کو بس ذرا اس امر کا لحاظ کرنا ہوگا کہ اس کی خوشی کسی دوسرے کی شادمانی میں خلل نہ ڈالے۔ اس پر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تناقض فی الاصطلاحات (CONTRADICTION IN TERMS) نہیں ہے کہ ایک طرف لطف و لذت کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدر قرار دیا جائے اور دوسری طرف آپ سے یہ توقع بھی رکھی جائے کہ آپ دوسروں کی خاطر ایک ایسے قاعدے کی پابندی کریں جو اپنی خوشی سے دست بردار ہو جانے کا آپ سے مطالبہ کرتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسانوں کی خاطر اپنے سرور سے صرف اسی صورت میں دستبردار ہو سکتا ہے جبکہ یہ دستبرداری اس کے نزدیک خود اس کی اپنی ذاتی مسرت سے بلند تر قدر و منزلت کی حامل ہو، مگر آپ کے فلسفے نے تو اس کے لیے اس کی اپنی ہی خواہشات کی تسکین کو بلند ترین قدر بنا دیا ہے۔ جب تک اخلاقی اقدار کو بجائے خود زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار تسلیم نہ کیا جائے، اس وقت تک دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف

کا دور دورہ نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کا فہم و ادراک انسان کے لیے دشوار نہیں ہے۔ لیکن جو شیطان انسان کے باطن پر اثر انداز ہے وہ انسان کو سوچنے کی مہلت نہیں دیتا۔ یہ نظریہ بھی کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے کہ خواہشاتِ نفس کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جانا واقعی انسان کو راحت و مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ انسان کو حقیقی سرور و اطمینان تو صرف اُس جد و جہد کے طفیل ہی حاصل ہوتا ہے جو وہ نیکی کے سرانجام دینے میں صرف کرتا ہے۔ یہ جد و جہد جتنی سخت ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں اتنی ہی زیادہ راحت و طمانیت نصیب ہوتی ہے۔ مغربی فلاسفی کا مفروضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی اخلاقی جد و جہد کے بغیر تنہا انسانی ذہانت اور غور و فکر کے بل پر ایسا معاشرہ وجود میں لایا جا سکتا ہے جس میں معقولیت اور انصاف کو غلبہ حاصل ہو۔ یہ مفروضہ اُس شیطان کو نظر انداز کر کے قائم کیا گیا ہے جو انسان کے اندر چھپا بیٹھا ہے، جس پر فتح پانے کے لیے نہایت سنجیدہ اور شدید کشمکش کی حاجت ہے، اور درحقیقت اس کشمکش کے باوجود وہ شیطان پوری طرح مغلوب نہیں ہو سکتا۔ حق کی راہ نہایت کٹھن اور دشوار ہے۔ اس کی منزل اتنی بلند اور بعید ہے کہ وہ آخر وقت تک ایک مطمح نظر ہی رہتی ہے جس کے منتہا کو نہیں پایا جا سکتا۔ محض عقل و ذہانت کے بل پر اس مسئلے کو حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ سخت ضبط و تحمل، بے نفسی اور ایثار اس کے لیے درکار ہے اور زندگی کا مادّہ پرستانہ نظریہ اتنا بودا ہے کہ وہ اس صبر آزما مہم کے لیے کوئی مستحکم بنیاد فراہم نہیں کر سکتا۔ اتنی عظیم قربانی پیش کرنے کے لیے ایک زبردست محرک درکار ہے اور اس قربانی کے بغیر دنیا میں قیامِ عدل ممکن نہیں ہے۔ یہ محرک صرف ایمان باللہ ہی میں پایا جاتا ہے۔

اسلامی ریاست ایک مثالی ریاست اسلامی ریاست ہمارے لیے ایک مثالی ریاست ہے۔ اس کا اولین مقصد ہی اپنے شہریوں کے اندر خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، موجودہ زندگی اس کے لیے محض تیاری اور زادِ سفر ہے۔ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست بھی ہے مگر اس میں روحانی و اخلاقی مقاصد کو مادّی مقاصد پر بالادستی حاصل ہے۔ یہ ریاست وسیع تر انسانی برادری کے مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حدود کے اندر اسلامی اخوت کا ایک دائرہ تشکیل کرتی ہے۔ یہ اغنیاء سے مال لے کر فقراء کی طرف لوٹاتی ہے اور اس طرح دولت کی منصفانہ تقسیم کرتی ہے۔ ایک ایسی ریاست جس کی

بنیاد اطاعتِ الٰہی اور آخرت کے لیے خیر کی کمائی پر رکھی گئی ہو، وہ اعمالِ صالحہ کے لیے ایک بہترین محرک فراہم کرتی ہے اور جذبہ و عمل کی یہی صالحیت ریاستِ اسلامی کے جواز و استحسان کے لیے دلیل مہیا کرتی ہے۔ اس طرح کی ایک ریاست اپنے اصولوں کے پیشِ نظر نہ بین الاقوامی تعلقات میں اخلاق اور خوش معاملگی کا دامن چھوڑ سکتی ہے، نہ خود اپنے شہریوں سے کسی قسم کی بے انصافی برت سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی اعتراض ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے خلاف پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ موجودہ اس نام سے جو ریاست قائم کی جائے گی وہ صحیح معنوں میں اسلامی نہیں ہوگی اور اس کے بنیادی تصورات پر عملدرآمد نہ ہوگا۔ میں بھی مانتا ہوں کہ اسلامی ریاست کو وجود میں لانے کا عمل بہت دشوار ہے اور اس راہ میں بڑی مشکلات حائل ہیں۔ بہت سے مسلمان ایسے موجود ہیں جن کو اس کا قیام گوارا نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی خواہشات و مرضیات کے موافق نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کا مطالبہ ہم سب سے لازماً یہ ہوگا کہ ہم سچے مسلمان بن کر رہیں، اور ظاہر ہے کہ ہم سچے مسلمان نہیں ہیں۔ میں نے اہلِ مغرب کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا بہت بڑی حد تک اطلاق آج کل کے مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ تہذیبِ حاضر کا بس ایک سستا ایڈیشن ہیں آج اگر ہم انسانیت کو دو طبقوں میں منقسم کردیں، ایک وہ جو خدا کے بندے ہیں اور دوسرے وہ جو بندگانِ نفس ہیں، تو اس زمانے کے مسلمانوں کا شمار علی العموم دوسرے ہی طبقے میں ہوگا۔

اسلامی ریاست کا طریقِ کار اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست کام کس طرح کرتی ہے۔ اپنے بنیادی تصورات کی ٹھیک مطابقت میں یہ ریاست حسبِ ذیل طریقوں پر چلتی ہے جنہیں اسلام کے سیاسی نظریہ اور اصولِ قانون نے تسلیم کیا ہے:

(۱) مقننہ اپنی قانون سازی میں حدودِ شرعیہ کی پابند ہوگی۔ وہ کوئی ایسا قانون بنانے کی مجاز نہ ہوگی جو شریعت سے متصادم ہو۔ ان حدود کے اندر حالات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے ہر طرح کی قانون سازی ممکن ہوگی، مگر اس میں بھی روحِ شریعت کو نظرانداز نہ کیا جائے گا۔

(۲) عدلیہ اپنے عام عدالتی فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ حکمرانوں اور عام شہریوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے کا خصوصی فریضہ بھی ادا کرے گی اور اس امر کی نگرانی کرے گی کہ اربابِ اقتدار اپنے اختیارات

شریعت کے مطابق استعمال کر رہے ہیں یا نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔ (النساء: ۵۹)	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو تو اسے لوٹا دو اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور یوم آخرت پر۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

یہاں یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں اولی الامر کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہو، تو اس وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع ہو گا۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ایک علیحدہ ادارہ ایسا موجود ہو جو اس طرح کے تنازعات کا تصفیہ اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ ادارہ آزاد عدلیہ ہی کا ہو سکتا ہے۔ عدلیہ ہی کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ کوئی قانون یا انتظامیہ کا کوئی حکم شریعت کے موافق ہے یا نہیں۔

(۳) مناصبِ اقتدار کو انتخاب کے ذریعے سے پُر کیا جائے گا۔ اس اصول کا ثبوت تین قرآنی آیات سے ملتا ہے۔ پہلی آیت کہتی ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ۔ (النور۔ ۵۵)	اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے کہ وہ انہیں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے۔

یہاں خلافت کا وعدہ پوری جماعت سے کیا گیا ہے، اس کے چند افراد سے نہیں کیا گیا۔ امیر ریاست اُن اختیارات کو نیابۃً استعمال کرے گا جو اللہ نے مسلمانوں کی جماعت کو سونپے ہیں اور اس بنا پر درحقیقت وہ اصل خلیفہ، یعنی جماعت مسلمین کا نائب ہو گا۔

دوسری آیت وہ ہے جسے میں پہلے نقل کر چکا ہوں۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمان باہم مشورے سے کام کرتے ہیں۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ، ۳۸)۔ تیسری سورۂ نساء کی آیت ۵۹ ہے جس میں اُن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ یہاں "مِنْکُم" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ اہلِ ایمان اپنے اندر سے ان لوگوں کو خود چنیں گے جو ان کے اولی الامر ہوں۔ فی الحقیقت انتخاب کے ماسوا اُن کے تقرّر کا کوئی دوسرا طریقہ تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شریعت نے کسی نسلی یا موروثی استحقاق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی قول یا عمل ایسا موجود نہیں ہے جو موروثی استحقاق، یا اصحابِ امر کے تقرر کا کوئی دوسرا طریقہ تجویز کر رہا ہو، اس لیے صرف ایک ہی قابلِ عمل صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ ہے انتخاب۔

(۴) اسلامی ریاست کو ایک بیت المال قائم کرنا ہوگا جس میں مسلمانوں سے لی جانے والی زکوٰۃ جمع ہوگی۔ اسلامی قانون کی رُو سے یہ ایک خاص ادارہ ہے جسے اغنیاء سے مال کی ایک متعین مقدار لے کر غریبوں میں تقسیم کرنے کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے۔ اسلامی ریاست شہریوں کی بنیادی ضروریات، یعنی خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم کی ذمہ دار ہے۔

(۵) اسلامی ریاست کو لوگوں کی اخلاقی حالت سدھارنے اور بہتر بنانے کے لیے بھی تمام ممکن تدابیر عمل میں لانی ہوں گی۔ وہ ایسے قوانین بنائے گی جو خدا کے حرام کیے ہوئے اعمال کو جرم قرار دیں گے، اور ایسے ادارے قائم کرے گی جن کا کام معروف کو فروغ دینا اور منکر کا استیصال کرنا ہوگا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آلِ عمران ۔ ۱۱۰)	تم دنیا میں وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(۶) اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو صرف ایک استثنائی صورت کے سوا باقی تمام امور میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو خود مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے غیر مسلم اہلِ ذمہ کے حقوق کی تصریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَمْوَالُهُمْ کَاَمْوَالِنَا وَدِمَاءُهُمْ کَدِمَائِنَا — ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور اُن کے خون ہمارے خون کی طرح ہیں۔

البتہ غیر مسلموں کو اُن کلیدی مناصب پر فائز نہیں کیا جا سکتا جو مملکت کی پالیسی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اسلامی ریاست ایک اصولی اور مقصدی ریاست ہے، اِس بنا پر اس کی پالیسی کو کنٹرول کرنے کا کام صرف اُنہی لوگوں کے سپرد کیا جا سکتا ہے جو اس ریاست کے اصول و مقاصد پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر بنیادی ضروریات کی فراہمی میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تمیز نہیں۔ ان کے شخصی قوانین میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی تاوقتیکہ وہ شریعت اسلامی سے متصادم نہ ہوں۔ شادی بیاہ، وراثت اور ولایت وغیرہ معاملات میں ان کے اپنے ہی قوانین کا ان پر اطلاق ہو گا۔

شہریوں کے بنیادی حقوق اب ہم اُن دیوانی اور فوجداری قوانین کی طرف آتے ہیں جو اسلامی ریاست میں نافذ ہوں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اُن بنیادی حقوق پر بحث کرنی ہے جو اس کے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شریعت اسلامی چونکہ ناقابل تغیر و تبدل ہے اس لیے اس کے قوانین میں انسانوں کو جو حقوق عطا کیے گئے ہیں وہ بنیادی اور اساسی ہیں، کوئی مجلس قانون ساز اُن میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے کی مجاز نہیں ہو سکتی۔ میں نے بغیر کسی گہری چھان بین کے مندرجہ ذیل بنیادی حقوق معلوم کیے ہیں۔ اگر اسلامی قانون کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو مزید حقوق کا پتہ لگایا جا سکتا ہے:

(۱) مذہبی آزادی قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (البقرہ - ۲۵۶) — دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

یہ آیت اس اصول کی صراحت کرتی ہے کہ دین میں کسی طرح بھی دخل اندازی نہیں کی جا سکتی۔ متعدد دوسری آیات بھی اسی نتیجے پر پہنچاتی ہیں:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى — اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین

يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس - ۹۹) ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (النور - ۵۴) رسول پر اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

(۲) جان کی حفاظت کا حق | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عظیم مجمع کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"تمہاری جانیں اور تمہارے مال قیامت تک کے لیے ایک دوسرے پر اُسی طرح حرام ہیں جس طرح کہ حج کا یہ دن"

قرآن مجید میں بھی انسانی جان کی حرمت کے بارے میں متعدد آیات ملتی ہیں، مثلاً

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (المائدہ - ۳۲) جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (الانعام - ۱۵۱ - بنی اسرائیل، ۳۳) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔

(۳) ملکیت کے تحفظ کا حق | اوپر ہم نے حجۃ الوداع کے جس خطبے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں مال کی حفاظت کا ذکر بھی پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ ہمیں خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ایک مثال ایسی ملتی ہے جس میں آپ نے قیمت کے بغیر زمین حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے آپ نے بنی نجار سے ایک زمین حاصل کرنے کا ارادہ فرمایا۔ زمین کے مالک نے بلا معاوضہ اس کی پیش کش کر دی مگر آپ نے اسے معاوضہ کے بغیر لینا قبول نہ فرمایا اور زمین معاوضہ دے کر ہی حاصل کی گئی۔

(۴) کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے قصوروں کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا | قرآن کہتا ہے:

لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر-۱۸) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

(۵) شخصی آزادی | حسبِ ذیل حدیث اِس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں ہر شخص آزاد ہے جب تک اس کے خلاف ایک متعین الزام ثابت نہ کر دیا جائے۔ مدینہ میں کچھ لوگوں کو حکام نے شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جس وقت خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، ایک صحابی نے عین خطبہ کے دوران میں اٹھ کر سوال کیا کہ میرے ہمسایوں کو کن وجوہ سے پکڑا گیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو مرتبہ اُن کے اس سوال کو سن کر سکوت فرمایا۔ کوتوال شہر وہاں موجود تھا۔ جب تین مرتبہ یہ سوال اٹھائے جانے کے باوجود پولیس کے افسر نے کوئی وجہ پیش نہ کی تو آپ نے حکم صادر فرمایا کہ خَلُّوْا لَہٗ جِیْرَانَہٗ "اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو"۔ امام خطّابی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام میں حبس دو ہی قسم کا ہے۔ ایک حبسِ عقوبت، یعنی یہ کہ عدالت سے سزا پا کر کوئی شخص قید کیا جائے۔ دوسرے حبسِ استظہار، یعنی ملزم کو بغرضِ تفتیش روک لیا جائے۔ یہ اس حدیث سے امام خطّابی کا استنباط ہے۔ امام ابو یوسف نے بھی یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ ایک شخص کو صرف ثابت شدہ الزامات کی بنا پر ہی قید کیا جا سکتا ہے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"اسلام میں کوئی شخص انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا"۔

۶۔ آزادیٔ رائے کا حق | اسلام نہ صرف اظہارِ رائے کی آزادی کا حق دیتا ہے بلکہ وہ اسے بہت بڑی نیکی قرار دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "سب سے افضل جہاد جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے"۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا "سیّد الشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہیں اور وہ جری شخص ہے جس نے کسی جابر اور مستبد فرمانروا کے سامنے کھڑے ہو کر اُسے نیکی کرنے اور بُرائی سے باز رہنے کی تلقین کی اور اِس جُرم پر اُس فرمانروا کے ہاتھوں شہادت پائی"۔

تاریخِ اسلام کا وہ واقعہ بہت مشہور ہے جس میں ایک صحابی نے حضرت عمرؓ کے سامنے یمنی چادروں کے بارے میں ان سے بازپرس کی تھی اور اُن سے برملا کہا تھا کہ انہوں نے دوسرے لوگوں سے زائد حصّہ

وصول کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس صحابی کو یہ کہہ کر خاموش کرنے کی قطعاً کوشش نہ کی کہ ان کی ذات پر کوئی شخصی حملہ نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ وہ اس معاملہ کی وضاحت کر دیں اور انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ مَیں نے اپنے حصّے کی چادر اپنے محترم والد کو دی ہے۔ خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ نے خارجیوں تک سے جو علانیہ ریاست کے وجود کی ضرورت کا انکار کرتے تھے، اُس وقت تک تعرّض نہ کیا جب تک وہ قتل و غارت کا ارتکاب نہ کریں۔ آپ نے انہیں یہ پیغام بھیجا:

"تم جہاں چاہو رہو، ہمارے اور تمہارے درمیان شرط بس یہ ہے کہ تم خونریزی نہ کرو اور ظلم سے باز رہو۔"

ایک اور موقع پر انہوں نے خارجیوں سے فرمایا:

"جب تک تم بدنظمی اور فساد برپا نہ کرو گے ہم تمہارے خلاف جنگ نہ کریں گے۔"

مساوات اسلام انسانی مساوات پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات۔۱۳)	لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل دے دی تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک معزز تر وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر نیکی اور پرہیزگاری کے سوا کوئی فضیلت نہیں۔"

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے قریش کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا:

"اے قومِ قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور نسب کے فخر و غرور کا خاتمہ کر دیا۔ لوگو، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے

زیادہ پرہیزگار ہے :

ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"سنو اور اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی غلام ہی تم پر حاکم بنا دیا جائے"

آپؐ نے بارہا اس امر کی صراحت فرمائی ہے کہ آپؐ بھی دوسرے انسانوں ہی کی طرح ہیں ۔ البتہ آپؐ کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان وجہ امتیاز صرف یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے ۔ آپ کا ارشاد ہے الخلق عیال اللہ ۔

۸ ۔ عزت کے تحفظ کا حق | قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔ (النساء ۱۴۸)

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی توہین آمیز بات علانیہ نہیں کہی جا سکتی الا یہ کہ کسی شخص پر ظلم ہوا ہو اور وہ اپنی مظلومی کا اظہار کرے ۔ کسی الزام کا محض صحیح ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی تشہیر بھی کی جائے ۔

۹ ۔ معروف عدالتی طریق کار کے مطابق فیصلے کا حق | اسلامی قانون کی رو سے کسی فرد کے حقوق صرف اُن شہادتوں اور بیانات کی بنا پر ہی متاثر ہو سکتے ہیں جو ایک عدالتی کارروائی کے دوران میں پیش ہوں ۔ یہ مضمون ایک حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"مجھے جس چیز کا مکلف ٹھیرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو روداد مقدمہ میرے سامنے پیش ہو اس پر فیصلہ کر دوں ۔ اصل حقیقت کو تو خدا ہی جانتا ہے"

۱۰ ۔ صفائی پیش کرنے کا حق | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں آپ نے فرمایا :

"تم اُس وقت تک کسی مقدمے کا فیصلہ نہ کرنا جب تک دوسرے فریق کی بات بھی اسی طرح نہ سن لو جس طرح کہ تم نے پہلے فریق کی بات سنی تھی"

دیوانی قانون بنیادی حقوق کی بحث کے بعد اب ہم دیوانی قانون کو لیتے ہیں۔ میں یہاں صرف بڑی بڑی نمایاں تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہوں جو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے ناگزیر ہیں۔ دوسری تبدیلیاں جو ہمیں کرنی ہونگی ان کا ذکر میں اس لیے نہیں کرتا کہ زیادہ تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

(۱) پہلی بڑی تبدیلی سُود کے معاملہ میں کرنی ہوگی۔ یہ تبدیلی کس حد تک کرنی ہوگی، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ بعض حلقوں میں یہ بحث اٹھائی جا رہی ہے (جس کے دلائل کے وزن کی جانچ ابھی ہونی ہے) کہ قرآن میں لفظ ربا سے مراد صرف USURY ہے اور بینک سے جو INTERERESТ ملتا ہے اس پر کسی حالت میں بھی ربا کا اطلاق نہیں ہوتا۔

(۲) شریعت دیوانی معاملات میں کسی قانونِ میعاد کو تسلیم نہیں کرتی۔ میعاد کا قانون دراصل انفرادی معاملات میں انصاف کی بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ اِس پبلک پالیسی پر مبنی ہے کہ پرانے جھگڑوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ میں اس امر کے متعلق کوئی بیان تو نہ دونگا کہ اسلامی ریاست کی پبلک پالیسی کیا ہوگی مگر اس معاملہ میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ موجودہ قانونِ میعاد کا کوئی حصہ اگر باقی رکھا بھی گیا تو اس کا ایک اچھا خاصا حصہ رخصت ہو جائے گا۔ کم از کم قبضۂ مخالفانہ کو تو شریعت گوارا نہیں کر سکتی۔ اسلامی تصورِ حیات اس بات کو ہرگز جائز نہ رکھے گا کہ اگر ایک شخص دوسرے کی ملکیت میں مسلسل مداخلت بے جا کرتا رہے، جو بہرحال ایک ظلم ہی ہے اور عموماً اسے جرم قرار دیا جاتا ہے تو ۱۲ سال گزر جانے کے بعد اس جائداد پر اسے حقِ ملکیت حاصل ہو جائے گا۔ اسلامی ریاست سب سے زیادہ اپنے شہریوں کی اخلاقی فلاح و بہبود سے دلچسپی رکھتی ہے۔ دنیا کی موجودہ زندگی آخرت کی ابتدائی منزل قرار دی گئی ہے۔ یہ اعتبارات لازماً ہمارے قانونی تصورات پر اثر انداز ہونگے۔ ایک اسلامی ریاست کسی ایسے قانون کی حمایت نہیں کر سکتی جس کے تحت گناہوں اور اخلاقی برائیوں سے منفعت بخش نتائج برآمد ہونے ہوں۔

(۳) قانونِ معاہدہ (اسلامی اصطلاح میں عقود) کے اندر بھی چند تغیرات رونما ہونگے۔ اسلام بیعِ غرر اور سٹہ بازی کی نوعیت کے معاہدات کو جائز نہیں رکھتا۔ اور احتکار کی اجازت بھی نہیں دیتا جس سے مراد اشیائے

ضرورت کی قیمتیں چڑھانے کی خاطر ان کو روک رکھنا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ میں تو ریاست کے قانونی نظام میں بڑی تبدیلیاں تجویز کر رہا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بات یہی ہے۔ بلاشبہ اسلام موجودہ طرز زندگی سے بمشکل ہی کوئی مطابقت رکھتا ہے، ——— خواہ وہ اہل مغرب کا طرز زندگی ہو یا زمانۂ حال کے مسلمانوں کا۔ اگر ہمیں ایک حقیقی اسلامی ریاست قائم کرنی ہے تو ہم کو اپنا پورا نظریۂ حیات تبدیل کرنا ہوگا۔ اسلام ایک متقیانہ مذہب ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اسی دنیا کی بہتری کو مقصد حیات بنا لیا جائے۔ مسلمان ہونے کے لیے ایک آدمی کو قربانی، ایثار اور ضبط نفس کی زندگی اختیار کرنی ہو گی۔

فوجداری قانون | اب ہم ان تغیرات کو لیتے ہیں جو قانون فوجداری میں کی جائیں گی۔

قرآن مجید میں قتل، ڈاکہ زنی، زنا، چوری اور قذف کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔

قتل کی سزا موت ہے، لیکن میت کے ورثا کو معاف کرنے اور خونبہا قبول کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑا اہم تغیر ہے اور اس جرم کے معاملہ میں یہ تغیر ہمیں قانون میں کرنا ہوگا۔

ڈاکہ زنی کی سزا موت، یا ہاتھ اور پاؤں کاٹنا، یا قید ہے۔

زنا کی سزا قرآن میں ضرب تازیانہ ہے، مگر ایک قانونی رائے یہ ہے کہ شادی شدہ اشخاص کے معاملہ میں زنا کی سزا رجم ہے۔

چوری کی سزا قطع ید خاص توجہ کی مستحق ہے۔ ایک سال سے زیادہ ہوا کہ سڈنی (آسٹریلیا) میں جب اس سزا کا ذکر کیا گیا تو اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور کہا گیا کہ یہ ایک وحشیانہ اور غیر انسانی فعل ہے۔ اسی بنا پر میں یہاں اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے میں اس بات پر اظہار حیرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہے جنہوں نے تاریخ کے سب سے زیادہ غیر انسانی فعل کو حق بجانب ٹھیرایا ہے، یعنی انسانوں پر جوہری ہتھیاروں کا استعمال، جس کی بدولت لاکھوں مرد، عورت، بچے، حتیٰ کہ شیر خوار معصوم تک آن کی آن میں جل کر خاک ہو گئے، اور جو موت سے بچ گئے وہ تازیست عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس دعوے

کے ساتھ کیا گیا کہ انسانیت کی بھلائی اس میں مضمر تھی، مگر اس دعوے کو ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔
اس واقعہ کی شدت کے بارے میں خواہ کوئی نرم رائے اختیار کرے یا سخت۔ بہرحال جو لوگ بھی اسے حق بجانب ٹھیراتے ہیں وہ اس نظریے کے قائل ہوگئے ہیں کہ کسی فعل کے خلاف انسانیت ہونے کا فیصلہ خود اس فعل کی نوعیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اُس کے نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ نیز انہوں نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ کسی خلافِ انسانیت فعل کے حق بجانب ہونے کا فیصلہ کرتے وقت اُس شخص کی بے گناہی بلکہ کم سنی کا لحاظ بھی نہیں کیا جائے گا جسے اس فعل کا تختۂ مشق بنایا گیا ہو۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر مان لی جائیں تو پھر پورے پورے علاقوں کی آبادیوں کو گھیر کر کیمپوں میں جمع کر دینا، مخالفین کا صفایا کر دینا، ایک نسل کو فنا کر دینے کی کوشش کرنا، بدترین عذاب دینا، اور بڑے پیمانے پر بے گناہوں کو قتل کرنا بھی حق بجانب ہی ہونا چاہیے، جبکہ ان افعال کے مرتکبین کا دعویٰ یہ ہو کہ انہوں نے انسانی بھلائی کی خاطر یہ کام کیے ہیں۔ یہ بات واقعی بڑی حیران کن ہے کہ بیسویں صدی کو انسانی ترقی کا ادعا تو بہت ہے مگر عملاً جو خلافِ انسانیت حرکتیں اس صدی میں ہوئی ہیں ان کا ایک فیصد بھی پچھلی صدیوں میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ (باقی)

نکاحِ فاسد اور نکاحِ باطل پر ایک اصولی بحث

(ملک غلام علی صاحب)

[نکاح فاسد اور نکاح باطل کے مسئلے پر یہ مختصر اور اصولی بحث ایک فاضل قانون دان کے استفسار کے جواب میں سپردِ قلم کی گئی تھی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ بعض فقہاء نے نکاح باطل اور نکاح فاسد کی جو تفریق قائم کی ہے یہ کس اصول پر مبنی ہے، دونوں کی جامع و مانع تعریف کیا ہے اور ان کے قانونی نتائج و عواقب کیا مترتب ہوتے ہیں۔ امر واقعی یہ ہے کہ جن فقہائے کرام کے ہاں نکاحِ فاسد اور نکاحِ باطل کا امتیاز پایا جاتا ہے۔ انہوں نے دونوں کی کوئی جامع تعریف بیان نہیں فرمائی ہے۔ ان اصطلاحات کے استعمال اور ان کی بیان کردہ امثال میں بھی بڑا تفاوت اور وسعت موجود ہے ایک ہی قسم کے نکاح کو کہیں باطل اور کہیں فاسد قرار دیا گیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کتاب و سنت اور فقہاء کے اقوال و اجتہادات کو بحیثیتِ مجموعی سامنے رکھتے ہوئے نکاح باطل اور نکاح فاسد کی قانونی تعریف الگ الگ متعین کی جائے اور پھر اس کی روشنی میں اقسامِ نکاح کو باطل یا فاسد قرار دیا جائے۔ اس بحث کی اشاعت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس مسئلے میں تردد اور عدمِ تعین کی کیفیت رفع ہو اور اہلِ علم ان تجویز کردہ تعریفات اور ان کے انطباق پر غور فرما کر رائے قائم کریں کہ وہ کس حد تک صحیح اور قابلِ قبول ہیں۔ یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ علماء کے اجماع یا کثرتِ رائے ہی سے یہ امر متحقق ہو سکتا ہے کہ کتنی یہ قول لیا جائے اور اس میں کوئی تبدیلی ممکن ہے یا نہیں۔]

غلام علی

اصولی طور پر نکاح کی صحت کے معاملے میں فقہاء و مجتہدین کا موقف ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس نکاح کو صحیح اور جائز قرار دیتے ہیں جس کے انعقاد میں کوئی شرعی مانع نہ ہو۔ اور جس نکاح کے

شرائط و ارکان میں سے کوئی شرط یا رکن مفقود ہو وہ فقہاء کے نزدیک غیر صحیح ہوگا۔ ناجائز اور غیر صحیح نکاح کی متعدد صورتیں ممکن ہیں اور فقہاء، بالخصوص فقہائے حنفیہ نے ان کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان کی مختلف صورتوں کے لیے "باطل" اور "فاسد" کی دو مختلف اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ باطل اور فاسد کی یہ تفریق شرعاً غیر ضروری اور بے اصل نہیں کہی جا سکتی۔ بہت سے معاملات اس طرح رونما اور انجام پذیر ہو سکتے ہیں کہ انہیں نہ بدیہی طور پر باطل کہا جا سکتا ہے اور نہ ہر لحاظ سے صحیح اور معیار مطلوب کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ انہیں بین بین رکھ کر باطل کے بجائے فاسد یا ناقص ہی کہا جائے گا۔

مگر مشکل یہ درپیش ہے کہ نکاح باطل اور نکاح فاسد کی کوئی جامع و مانع اور متفق علیہ تعریف خود فقہائے احناف کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ ان کی بحثوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک عام تأثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ باطل نکاح سے مراد وہ نکاح ہے جس کا عدم و وجود برابر ہو، جو قطعی طور پر کالعدم و غیر منعقد ہو اور ایسا صریح البطلان ہو کہ اسے باطل قرار دینے کے لیے ازالۂ نکاح کے کسی اعلان یا تفریق کی بھی ضرورت نہ ہو۔ اور فاسد نکاح وہ ہے جس کا جواز و عدمِ جواز یا انعقاد و عدمِ انعقاد مشتبہ ہو، یا جس کی شرائطِ صحت میں کوئی ایسا نقص یا فتور پایا جاتا ہو کہ اس کی بنا پر وہ معدومِ محض تو نہ ہو مگر شرعاً لائقِ فسخ ہو۔ لیکن مباحث کی پوری تفصیل دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعدد پہلوؤں میں اختلاف موجود ہے۔ بعض کے نزدیک جس طرح عبادات کے معاملے میں فساد اور بطلان کے ایک ہی معنی اور یکساں اثرات ہیں، اسی طرح نکاح فاسد اور نکاح باطل میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض کے قول کے مطابق جس نکاح کے عدمِ جواز پر علماءِ امت کا اتفاق ہو وہ باطل ہے اور جس کے عدمِ جواز میں اختلاف منقول ہو وہ فاسد ہے۔ لیکن فقہائے حنفیہ کے ہاں نکاح کی بعض ایسی صورتیں بھی باطل کے بجائے فاسد قرار دی گئی ہیں جن کی حرمت اور عدمِ جواز پر پوری امت کا اجماع ہے اور اکثر حالتوں میں یہ اجماعِ امت محض قیاس و اجتہاد پر مبنی نہیں بلکہ کتاب و سنت کی تصریح اور قطعی نصوص پر مبنی ہے۔

اس مسئلے میں مزید پیچیدگی اس وجہ سے بھی پیدا ہو گئی ہے کہ فقہاء بالعموم تو باطل اور فاسد کے

الفاظ کو خالص محدود قانونی اصطلاح کے طور پر ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال کرتے ہیں اور ان کے مابین امتیاز بھی قائم کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات وہ انہیں وسیع غیر اصطلاحی معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں اور وہاں کوئی قانونی امتیاز مقصود نہیں ہوتا۔ جہاں تک "نکاح باطل" کے الفاظ کا تعلق ہے، یہ الفاظ حدیث میں بھی وارد ہوئے ہیں، مگر وہاں بھی یہ ان خاص اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیے گئے ہیں جن میں یہ بعد میں رائج ہوئے ہیں۔ احادیث میں ارشادِ نبوی ہے: ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیہا فنکاحہا باطل (جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے)۔ اگرچہ اس حدیث کا مطلب بعض حضرات نے یہ لیا ہے کہ ایسا نکاح سرے سے کالعدم اور باطلِ محض ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہاں باطل کا لفظ مخصوص فقہی اصطلاح کے طور پر نہیں آیا ہے، بلکہ کتاب و سنت کی مجموعی تعلیمات کے پیشِ نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا منشاء یہ ہے کہ ایسا نکاح ولی کی رضامندی پر موقوف ہوگا اور اس کی عدم رضا اور معقول شرعی اعتراض کی صورت میں قابلِ تنسیخ ہوگا۔

اس اختلاف اور پیچیدگی کو رفع کرنے کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ نکاحِ باطل و نکاح فاسد کی تعریف، مختلف اشکالِ نکاح پر اس کی تطبیق اور اس کے قانونی اثرات کی تعیین میں مجرد چند فقہی اقوال پر کلیتہً انحصار نہ کیا جائے، بلکہ قرآن و حدیث کی تصریحات اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں اس پورے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر از سرِ نو غور کر کے کوئی رائے قائم کی جائے۔

اس ضمن میں اولین حل طلب مسئلہ جو ہمارے سامنے آتا ہے، وہ نکاح فاسد اور نکاح باطل کی تعریف کا ہے۔ پہلے ہم نکاحِ باطل کو لیتے ہیں۔

نکاح باطل کی تعریف کتاب و سنت میں نکاح سے متعلق جو احکام و ہدایات وارد ہیں اور فقہائے اسلام نے اس سلسلے کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں، ان سب پر غور و فکر کے بعد نکاحِ باطل کی جو تعریف اقرب الی الصواب معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ "نکاح باطل وہ نکاح ہے جس کی حرمت یا ممانعت یا عدمِ جواز کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے قطعی دلالت کے ساتھ ثابت ہو اور اس ثبوت پر فقہائے امت کا اجماع ہو۔ یا جس نکاح میں فریقین یا کسی ایک فریق کی جانب سے ایجاب و قبول اور اذن و رضا

مفقود ہو۔"

نکاح باطل کی مثالیں

ایجاب و قبول کا فقدان تو زیادہ وضاحت طلب نہیں ہے لیکن حرمت، ممانعت اور عدم جواز کی صورتوں کو واضح کرنے کے لیے چند مثالوں کا ذکر اور مختصر تشریح ضروری ہے جو درج ذیل ہے:

(۱) اہلِ کتاب عورت کے ماسوا دیگر کافر و مشرک عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح ممنوع ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۱ اور سورۂ مائدہ، آیت ۵ کو ملا کر پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ اور مسلم عورت کا نکاح بقرہ آیت ۲۲۱ اور الممتحنہ، آیت ۱۰ اور المائدہ آیت ۵ کی رُو سے ہر غیر مسلم سے ممنوع ہے خواہ وہ مشرک ہو یا اہلِ کتاب۔ ان دونوں ممنوع صورتوں میں سے کسی صورت پر بھی جو نکاح ہوں گے وہ باطل ہوں گے۔

(۲) باپ کی منکوحہ، ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، رضاعی ماں، رضاعی بہن، بیوی کی ماں، مدخولہ بیوی کی بیٹی، صلبی بیٹے کی بیوی سے نکاح، اور دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنا ممنوع و حرام ہے جیسا کہ سورۂ نساء، آیت ۲۲-۲۳ میں مذکور ہے۔ اس لیے یہ سارے نکاح بھی باطل ہوں گے۔ نسب، رضاعت اور حرمتِ جمع کی بنا پر جو ممنوع رشتے یہاں بیان ہوئے ہیں، ان میں سے بعض کے اصول و فروع اور ان سے علتِ حرمت میں مماثلت رکھنے والے بعض دوسرے رشتے بھی ایسے ہیں جن سے نکاح کی ممانعت حدیث سے ثابت ہے اور جن کی حرمت پر اجماعِ امت ہے۔ ایسے رشتوں کی موجودگی کا علم ہونے کے باوجود اگر ان سے نکاح ہوا تو وہ بھی باطل ہوگا۔

(۳) اگر دو بہنیں ایک مرد کے نکاح میں یکے بعد دیگرے جمع ہوں تو دوسری سے نکاح باطل ہوگا اور اگر دونوں کے ساتھ یکجا نکاح ہوگا تو دونوں نکاح باطل ہوں گے۔

(۴) منکوحۂ غیر یعنی جو عورت ایک شخص کے نکاح میں ہو، اس سے دوسرے شخص کا نکاح سورۂ نساء (آیت ۲۴) کی رُو سے حرام ہے، اس لیے باطل ہے۔ الا یہ کہ ناکح کو اس کے پہلے نکاح کا علم نہ ہو۔

(۵) معتدۂ غیر یعنی جو عورت ایک شخص کے نکاح کی عدت گزار رہی ہو، اس سے بھی دوسرے

مرد کا نکاح حرام ہے، اس لیے باطل ہے۔ بشرطیکہ مرد کو عدت کا علم ہو۔ اس حرمت کی علت وہی ہے جو منکوحۂ غیر میں پائی جاتی ہے، کیونکہ عدت کے دوران میں سابق نکاح کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ قرآن مجید نے عدت میں نکاح کی حرمت و ممانعت ان الفاظ میں اور بھی زیادہ مؤکد کر دی ہے: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ (عقد نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرو جب تک عدت اپنی انتہا تک نہ پہنچ جائے۔)

(۶) چار بیویوں کی موجودگی میں پانچواں نکاح بھی قرآن و حدیث کی رُو سے ممنوع ہے، اس لیے باطل ہے۔ یہ ممانعت سورۂ نساء آیت ۳ سے ثابت ہے، جہاں زیادہ سے زیادہ چار شادیوں تک کی اجازت دی گئی ہے۔ اس بات پر اجماعِ امت ہے کہ اس آیت میں چار کی تعداد کا ذکر تحدید اور احترازی قید کے طور پر کیا گیا ہے اور اس سے زائد نکاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا دوسرے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ (سورۂ احزاب، آیت ۵۰ میں عام مسلمانوں کے لیے اس پابندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضورؐ کو اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے)۔ ظاہریہ کی جانب یہ بات بعض اصحاب نے غلط منسوب کر دی ہے کہ وہ چار سے زائد نکاح جائز سمجھتے ہیں، حالانکہ امام ابن حزم ظاہری نے المحلّٰی، کتاب النکاح میں صاف فرمایا ہے: لا يحل لاحد ان يتزوج اكثر من اربع نسوة (کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ چار عورتوں سے زائد نکاح کرے۔)

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد جن مسلمانوں کے نکاح میں چار سے زائد عورتیں تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ زائد عورتوں کو قیدِ نکاح سے خارج کر دیں۔ مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ: ان غيلان بن سلمة الثقفى اسلم وتحته عشر نسوة فقال له النبى صلى الله عليه وسلم اختر منهن اربعًا (غیلان بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ان میں سے چار کا انتخاب کر لو)۔ اسی طرح ایک دوسرے صحابی نوفل بن معاویہ کے نکاح میں پانچ عورتیں موجود تھیں تو آنحضورؐ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دو۔

بعض حضرات صرف اس صورت میں نکاح کو باطل قرار دیتے ہیں جب کہ وہ ابدی محارم و محرمات کے مابین ہو، یعنی ایسے رشتہ داروں سے ہو جو ہر حالت میں اور ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔ باقی رہے وہ رشتے جن میں حرمت عارضی ہے، ان میں نکاح ان حضرات کے نزدیک صرف فاسد ہو گا۔ مثلاً ایک بہن کی وفات یا اسے طلاق دینے اور عدت گزر جانے کے بعد دوسری بہن حرام نہیں رہتی۔ اسی طرح چار بیویوں میں سے ایک کے فوت ہونے یا نکاح سے خارج ہو جانے کے بعد پانچویں عورت سے نکاح جائز ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں حرمت چونکہ عارضی ہے، اس لیے اگر اس حرمت کے موجود ہوتے ہوئے کوئی نکاح کیا جائے تو ان کے نزدیک وہ باطل نہیں بلکہ صرف فاسد ہو گا۔ لیکن یہ استدلال زیادہ وزنی اور محکم نہیں معلوم ہوتا۔ شارع کی عائد کردہ حرمت و ممانعت، خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو جب تک وہ نافذ اور جاری ہے اور حلت یا اباحت میں تبدیل نہیں ہوئی ہے، اس وقت تک وہ اپنی شدت و تاثیر کے اعتبار سے ابدی حرمت کے مقابلے میں کمتر نہیں ہے۔ اس لیے محرمات سے نکاح، دو بہنوں سے نکاح، منکوحہ یا معتدۂ غیر سے نکاح اور چار کی موجودگی میں پانچویں عورت سے نکاح باطل اور کالعدم ہونے کے لحاظ سے ایک ہی درجے میں شمار ہونے چاہییں۔ ناکح کی لاعلمی جو بعض صورتوں میں ممکن ہے وہ پانچ عورتوں سے نکاح کے معاملے میں بالکل ناقابلِ تصور ہے کیونکہ کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ چار بیویوں کی موجودگی میں یہ میرا پانچواں نکاح ہے۔

جمہور فقہاء بشمول حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ جان بوجھ کر معتدۂ غیر سے نکاح باطل ہے۔ احناف کے نامور فقیہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ ایسے نکاح کے باطل ہونے پر اجماع ہے۔ ظاہر ہے کہ عدت بھی ایک عارضی مانع ہے جو لازماً کچھ عرصے کے بعد رفع ہو جائے گا اور بعض صورتوں میں عدت کے اندر بھی سابق خاوند کے لیے رجوع یا دوبارہ نکاح کا حق باقی نہیں رہتا اور ایک لحاظ سے عورت خارج از نکاح ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر معتدہ سے نکاح باطل ہے تو منکوحۂ غیر یا دو بہنوں یا پانچویں عورت سے دیدہ دانستہ نکاح باطل ہونے کے بجائے اس بنا پر کیوں محض فاسد ہو کہ ان کی حرمت عارضی ہے؟

بعض اصحاب نے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ شرعی مانع کے باوجود جب نکاح کا انعقاد عمل میں آجاتا ہے تو شبہ عقد (SEMBLANCE OF MARRIAGE) پیدا ہوجاتا ہے، اس لیے نکاح فاسد ہی ہوگا۔ باطل نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی شخص اگر جانتے بوجھتے محرمات سے نکاح کرلے تو کیا ذوق سلیم اور عقلِ عام یہ باور کرنے کے لیے تیار ہوسکتی ہے کہ یہ معاملہ عقد کے مشابہ ہے اور اس پر عقد کا شبہ یا گمان ممکن ہے؟ پھر یہ معاملہ محض عقل و ذوق پر موقوف نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسا ایک واقعہ پیش آچکا ہے کہ ایک بدبخت نے اپنے والد کی منکوحہ سے نکاح کرلیا تھا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا تھا۔ حدیث میں ہے: عن البراء بن عازب قال لقیت خالی ومعه الرایة فقلت این تریدقال بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلا تزوج امرأة ابیه من بعده ان اضرب عنقه واخذ ماله (حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ مجھے راستہ میں میرے ماموں ملے جن کے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا۔ میں نے پوچھا آپ کہاں جارہے ہیں؟ انہوں نے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ ایک شخص نے اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی سے شادی کرلی ہے مجھے حکم ہے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں اور اس کا مال ضبط کرلوں)۔ اس حدیث میں تزوج کے الفاظ صاف آئے ہیں، جن سے واضح ہے کہ اس شخص نے شادی کا ڈھونگ ضرور رچایا تھا، گویا شبہ عقد پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ڈھونگ کا لحاظ کیے بغیر اسے مباح الدم والمال قرار دے دیا۔

نکاحِ فاسد کی تعریف: نکاحِ باطل کی مندرجہ بالا تعریف اور مثالوں سے اس طرح کے نکاح کی حقیقت و ماہیت بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد نکاح فاسد کی تعریف کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ نکاحِ فاسد کا مجمل بیان اوپر کی بحث میں آچکا ہے۔ جہاں تک اس کی جامع تعریف کا تعلق ہے وہ ان الفاظ میں بیان ہوسکتی ہے کہ "نکاحِ فاسد ایسا نکاح ہے جس میں عقدِ نکاح کی شرائطِ صحت میں سے کوئی شرط ناقص یا غائب ہو، یا جس کی حرمت، ممانعت یا عدمِ جواز قرآن و حدیث سے قطعی دلالت کے ساتھ ثابت نہ ہو، یا جس کا جواز و عدمِ جواز یا انعقاد و عدمِ انعقاد مشتبہ یا فقہاء و مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ ہو، یا جس میں کوئی ایسا مانعِ شرعی حائل ہو جو نکاح کو باطل قرار دینے کے لیے کافی ہو لیکن فریقین یا کسی

ایک فریق کو اس مانع کے وجود کا علم نہ ہو اور بے خبری میں نکاح ہو جائے :

نکاحِ فاسد کی مثالیں اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں :

(۱) ایجاب و قبول پر دو مسلمان بالغ مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت صحتِ نکاح کے لیے شرط لازم ہے اگر یہ شہادت غیر موجود یا نامکمل ہو تو نکاح فاسد ہو گا۔

(۲) جن وجوہ سے ایک نکاح باطل ہوتا ہے اگر ان میں سے کوئی وجہ کسی نکاح میں فی الواقع تو موجود ہو مگر نکاح کے وقت فریقین میں سے کسی ایک کو یا مرد و عورت دونوں کو اس کی موجودگی کا علم نہ ہو اور وہ نیک نیتی سے نکاح کر بیٹھے یا کر بیٹھیں تو لاعلمی ثابت ہونے کی صورت میں نکاح باطل نہیں بلکہ فاسد ہو گا۔ مثلاً اگر انہیں باہمی حرام رشتے کا علم نہ ہو، یا ناکح کو یہ معلوم نہ ہو کہ عورت دوسرے مرد کے نکاح یا عدت میں ہے، تو نکاح فاسد ہو گا۔

(۳) اگر نکاحِ اول یا عدت کے وجود و عدمِ وجود میں فقہاء کا اختلاف ہو تو اس حالت میں نکاحِ ثانی یا نو جائز ہو گا یا ناجائز ہونے کی صورت میں صرف فاسد ہو گا۔ باطل نہ ہو گا۔

(۴) چار کی موجودگی میں پانچویں عورت سے نکاح میں بھی عورت کی جانب سے بعض حالات میں بے خبری کا عذر قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اگر تحقیق کے بعد اس امر کا ثبوت فراہم ہو جائے کہ عورت کو معلوم نہ تھا کہ ناکح کی پہلے سے چار بیویاں موجود ہیں۔ تو اس صورت میں بھی نکاح فاسد ہو گا۔

(۵) فقہائے اہلِ سنت نے نکاحِ موقت کو بھی نکاحِ فاسد شمار کیا ہے اور سنی زوجین کے درمیان ایسا نکاح فاسد ہو گا۔

قانونی نتائج نکاح باطل و نکاح فاسد کی تعریف و امثال کے بعد اب ان دونوں کے قانونی نتائج و عواقب کا بیان باقی رہ جاتا ہے، جسے اختصار کے ساتھ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

یہ بات تو شروع میں واضح کی جا چکی ہے کہ نکاحِ باطل اور نکاحِ فاسد دونوں شرعاً غیر صحیح، ناجائز اور مذموم ہیں اور ان میں فوری مفارقت واجب ہے۔ مگر دونوں کے قانونی نتائج میں فرق ہے اور ہونا چاہیے۔ نکاحِ باطل کو ختم کرنے کے لیے کسی کارروائی کی حاجت نہیں۔ یہ آپ سے آپ کالعدم، غیر موجود

اور بے اثر (NULL & VOID) ہے۔ زوجین میں سے ہر ایک پر لازم ہے کہ وہ بلا تاخیر دوسرے سے جدا ہو جائے ورنہ ریاست کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ جُدائی کرا دے۔ ایسے نکاح کے بعد مجامعت پر حدِ زنا تو قائم نہیں کی جائے گی مگر تعزیر دی جائے گی جو بعض صورتوں میں سلبِ اموال اور قتل تک ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی مہر واجب نہیں ہوگا۔ عدّت بھی لازم نہیں آئے گی۔ کیونکہ عدّت اس خلوتِ صحیحہ پر واجب ہوتی ہے جو جائز نکاح کے بعد ہو۔ نکاحِ باطل کا دخول زنا کا درجہ رکھتا ہے اور زنا کی کوئی عدّت نہیں ہوتی۔ البتہ عورت کو استبراءِ رحم تک انتظار کر لینا چاہیئے۔ نکاح باطل میں میراث نہیں ہے اور اگر اس کے نتیجے میں اولاد ہو تو اس کا نسب مرد سے ثابت نہیں ہوگا۔ ثبوتِ نسب کے لیے صرف اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ بچّے کا کسی خاص شخص کے نطفے سے ہونا متحقق ہو، بلکہ جائز تعلق نکاح کے نتیجے میں پیدا ہونا ہی اس کا نسب اسلام میں ثابت کر سکتا ہے۔ ورنہ داشتہ کی اولاد کا نسب بھی ثابت ماننا لازم آئے گا۔

جہاں تک نکاحِ فاسد کا تعلق ہے یہ بالکل کالعدم تو نہیں ہے مگر شرعاً ناقص اور غیر صحیح (INVALID & IRREGULAR) ہے اور لائقِ تفریق ہے۔ اس میں بھی زوجین پر لازم ہے کہ جونہی انہیں فسادِ نکاح کا علم ہو، وہ بلا تاخیر جدا ہو جائیں اور فسخ نکاح کا اعلان کر دیں۔ زوجین میں سے ہر ایک کو یہ اختیار حاصل ہے اور ہر ایک پر لازم ہے کہ جب معلوم ہو جائے کہ نکاح فاسد ہے تو وہ کہہ دے کہ میں نے نکاح کو فسخ کر دیا یا میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا میں نے تجھے طلاق دے دی۔ یہ اعلان فسخ و متارکہ ایک دوسرے کے سامنے بھی ہو سکتا ہے اور غیر حاضری میں بھی۔ جو بھی پہلے اعلان کر دے اسی سے نکاح زائل ہو جائیگا۔ اگر فریقین لیت ولعل کریں تو قاضی شرع پر لازم ہے کہ وہ تفریق کرائے۔ نکاح فاسد میں مجامعت ممنوع ہے۔ اگر دخول ہوگا تو سخت موجبِ گناہ ہوگا۔

نکاحِ فاسد میں جب تک دخول یا استراحتِ خاص نہ ہو اس وقت تک شرعاً اس کے کوئی نتائج و اثرات مترتب نہیں ہوتے۔ لیکن استراحتِ خاص تک نوبت پہنچ جائے اور تفریق اس کے بعد ہو تو اس نکاح پر درج ذیل نتائج مترتب ہوں گے:

(۱) اس نکاح پر عدّتِ طلاق واجب ہوگی اور اس وقت سے شروع ہوگی جب زوجین میں سے کسی ایک نے یا قاضی نے سب سے پہلے اعلان فسخ و تفریق کیا تھا (۲) مہر مثل یا مہر مسمّٰی میں سے جو بھی کم تر ہوگا، واجب الادا ہوگا۔ (۳) اگر اولاد ہوگی تو اس کا نسب ثابت ہوگا، وہ باپ کی جائز اولاد شمار ہوگی اور میراث میں حقدار ہوگی۔

رسائل و مسائل

کشمکشِ حق و باطل اور اس کی حقیقت

سوال: ایک عرصے سے ایک الجھن میں مبتلا ہوں۔ براہِ کرم اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں۔ الجھن یہ ہے کہ عہدِ نبوی و خلافت راشدہ کو چھوڑ کر آج کی تاریخ تک مسلمانوں کا وہ گروہ ہمیشہ ناکام کیوں ہوتا چلا آرہا ہے جس نے دین و ایمان کے تقاضے ٹھیک ٹھیک پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناکامی کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا سبب زیادہ تر اپنے ہی دینی بھائی بنتے رہے ہیں اور آج بھی بنے ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ "دین" جو دنیاوی زندگی کو درست کرنے کے لیے نازل ہوا ہے جس کا سارے کا سارا ضابطہ دنیوی زندگی میں عمل کرنے کے لیے ہے، جسے غالب کرنے کے لیے کئی خدا کے بندے اپنی زندگیاں ختم اور کئی وقف کر چکے ہیں، غالب کیوں نہ آسکا؟ اور دنیا کی غالب آبادی "دینِ اسلام" کی برکتوں سے عام طور پر کیوں محروم رہی ہے؟ خلقِ خدا کی عظیم الشان اکثریت چند مٹھی بھر زبردستوں کے ظلم و ستم کیوں سہتی چلی آرہی ہے؟ معاشی بے انصافی، تنگ دستی اور اذیتوں کی دردناک صورتوں سے کیوں دوچار رہی ہے؟ اور امن و سلامتی قائم کرنے والا دینِ حق اور اس کے نام لیوا کمزوروں، بے بسوں، مجبوروں اور معذوروں کا سہارا بننے میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے؟

جواب: آپ جس الجھن میں مبتلا ہیں وہ بآسانی حل ہو سکتی ہے اگر آپ ایک مرتبہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو انتخاب اور ارادہ کی آزادی بخشی ہے، اور

اسی آزادی کے استعمال میں اُس کا امتحان ہے۔ اِس حقیقت کو اگر آپ ذہن نشین کر لیں تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ کسی ملک یا قوم یا زمانے کے انسانوں میں اگر کوئی دعوتِ باطل فروغ پاتی ہے، یا کوئی نظامِ باطل غالب رہتا ہے، تو یہ اُس دعوت اور اُس نظام کی کامیابی نہیں بلکہ اُن انسانوں کی ناکامی ہے جن کے اندر ایک باطل دعوت یا نظام نے عروج پایا۔ اِسی طرح دعوتِ حق اور اس کے لیے کام کرنے والے اگر اپنی حد تک صحیح طریقے سے اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور نظامِ حق قائم نہ ہو سکے تو یہ نظامِ حق اور اس کے لیے کام کرنے والوں کی ناکامی نہیں بلکہ ان انسانوں ہی کی ناکامی ہے جن کے معاشرے میں صداقت پروان نہ چڑھ سکی اور بدی ہی پھلتی پھولتی رہی۔ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش بجائے خود ایک امتحان ہے، اور اس امتحان کا آخری نتیجہ اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں نکلنا ہے۔ اگر دنیا کے انسانوں کی عظیم اکثریت نے کسی ملک، کسی قوم، یا ساری دنیا ہی میں حق کو نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق ناکام اور باطل کامیاب ہو گیا۔ بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت اپنے رب کے امتحان میں ناکام ہو گئی جس کا بدترین نتیجہ وہ آخرت میں دیکھے گی۔ بخلاف اس کے وہ اقلیت جو باطل کے مقابلے میں حق پر جمی رہی اور جس نے حق کو سربلند کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دی، اِس امتحان میں کامیاب ہو گئی اور آخرت میں وہ بھی اپنی اِس کامیابی کا بہترین نتیجہ دیکھ لے گی۔ یہی بات ہے جو نوعِ انسانی کو زمین پر اتارتے وقت اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتا دی تھی کہ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (البقرہ۔ ۳۸۔ ۳۹)

اس حقیقت کو آپ جان لیں تو یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں بخوبی آ سکتی ہے کہ اہلِ حق کی اصل ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیں اور حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ بلکہ ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی حد تک باطل کو مٹانے اور حق کو غالب و سربلند کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح اور مناسب و کارگر طریقوں سے کوشش کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ یہی کوشش خدا کی نگاہ میں ان کی کامیابی

وناکامی کا اصل معیار ہے۔ اس میں اگر ان کی طرف سے دانستہ کوئی کوتاہی نہ ہو تو خدا کے ہاں وہ کامیاب ہیں، خواہ دنیا میں باطل کا غلبہ ان کے ہٹائے نہ ہٹے اور شیطان کی پارٹی کا زور اُن کے توڑے نہ ٹوٹ سکے۔

بسا اوقات آدمی کے ذہن میں یہ الجھن بھی پیدا ہوتی ہے کہ جب یہ دین خدا کی طرف سے ہے، اور اس کے لیے کوشش کرنے والے خدا کا کام کرتے ہیں، اور اس دین کے خلاف کام کرنے والے دراصل خدا سے بغاوت کرتے ہیں، تو باغیوں کو غلبہ کیوں حاصل ہو جاتا ہے اور وفاداروں پر ظلم کیوں ہوتا ہے؟ لیکن اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے آپ اس سوال کا جواب بھی خود پا سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ اُس آزادی کا لازمی نتیجہ ہے جو امتحان کی غرض سے انسانوں کو دی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ زمین میں صرف اس کی اطاعت فرمانبرداری ہی ہو اور سرے سے کوئی اس کی رضا کے خلاف کام نہ کر سکے تو وہ تمام انسانوں کو اُسی طرح مطیع فرمان پیدا کر دیتا جس طرح جانور اور درخت اور دریا اور پہاڑ مطیع فرمان ہیں۔ مگر اس صورت میں نہ امتحان کا کوئی موقع تھا اور نہ اس میں کامیابی پر کسی کو جنت دینے اور ناکامی پر کسی کو دوزخ میں ڈالنے کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر جب اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ نوعِ انسانی اور اس کے ایک ایک فرد کا امتحان لے تو اس کے لیے ضروری تھا کہ ان کو انتخاب اور ارادے کی، دبقدرِ ضرورتِ امتحان، آزادی عطا فرمائے۔ اور جب اُس نے ان کو یہ آزادی عطا فرما دی تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر سے مداخلت کر کے زبردستی باغیوں کو ناکام اور وفاداروں کو غالب کر دے۔ اِس آزادی کے ماحول میں حق اور باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اس میں حق کے پیرو، اور باطل کے علمبردار، اور عام انسان جن میں عام مسلمان بھی شامل ہیں، سب امتحان گاہ میں اپنا اپنا امتحان دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وفاداروں کی ہمت افزائی اور باغیوں کی حوصلہ شکنی ضرور کی جاتی ہے، لیکن ایسی مداخلت نہیں کی جاتی جو امتحان کے مقصد ہی کو فوت کر دے۔ حق پرستوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق کو غالب کرنے کے لیے کہاں تک جان

اڑاتے ہیں۔ عام انسانوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق کے علمبرداروں کا ساتھ دیتے ہیں یا باطل کے علمبرداروں کا۔ اور باطل پرستوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق سے منہ موڑ کر باطل کی حمایت میں کتنی ہٹ دھرمی دکھاتے ہیں اور حق کی مخالفت میں آخر کار خباثت کی کس حد تک پہنچتے ہیں۔ یہ ایک کھلا مقابلہ ہے جس میں اگر حق اور راستی کے لیے سعی کرنے والے پٹ رہے ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق ناکام ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ خاموشی کے ساتھ اپنے دین کی مغلوبی کو دیکھ رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق کے لیے کام کرنے والے اللہ کے امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبر پا رہے ہیں، اور یہ ظلم کرنے والے اپنی عاقبت زیادہ سے زیادہ خراب کرتے چلے جا رہے ہیں، اور وہ سب لوگ اپنے آپ کو بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں جو اس مقابلے کے دوران میں محض تماشائی بن کر رہے ہوں، یا جنہوں نے حق کا ساتھ دینے سے پہلو تہی کی ہو، یا جنہوں نے باطل کو غالب دیکھ کر اس کا ساتھ دیا ہو۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے مستثنیٰ ہیں، یا محض مسلمان کہلایا جانا ہی اس امتحان میں ان کی کامیابی کا ضامن ہے، یا مسلمان قوموں اور آبادیوں میں دین سے انحراف کا فروغ پانا اور کسی فاسقانہ نظام کا غالب رہنا کوئی عجیب معمّا ہے جو حل نہ ہو سکے اور ذہنی الجھن کا موجب ہو۔ خدا کی اس کھلی امتحان گاہ میں کافر، مومن، منافق، عاصی اور مطیع سب ہی ہمیشہ اپنا امتحان دیتے رہے ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ اس میں فیصلہ کن چیز کوئی زبانی دعویٰ نہیں بلکہ عملی کردار ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی مردم شماری کے رجسٹر دیکھ کر نہیں بلکہ ہر شخص کا، ہر گروہ کا اور ہر قوم کا کارنامۂ حیات دیکھ کر ہی ہوگا۔

مطبوعات

JEWISH CONSPIRACY AND THE MUSLIM WORLD.

صہیونی سازش اور دنیائے اسلام

تالیف: جناب مصباح الاسلام فاروقی صاحب۔

ملنے کا پتہ:- ۱-جی ۶/۳ ناظم آباد، کراچی۔

صفحات ۲۴۸ قیمت سات روپے، ۱۲ شلنگ یا تین ڈالر

صہیونی تحریک کے بارے میں مختلف کتب، اخبارات اور رسائل سے جو اطلاعات وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی رہتی ہیں ان سے اس کی ہر آن بڑھتی ہوئی قوت، اس کی زیر زمین سرگرمیوں اور پوری انسانیت اور خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف اس کے ناپاک عزائم کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس تحریک کا جس دیدہ وری کے ساتھ جناب مصباح الاسلام فاروقی صاحب نے تجزیہ پیش کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور اس سلسلے میں وہ پوری دنیا کے انسانوں اور خاص طور پر پوری امتِ مسلمہ کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اس معلومات افزا کتاب میں بڑے ٹھوس اور وزنی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ صہیونی تحریک اپنے سامنے کتنے خطرناک مقاصد رکھتی ہے اور وہ دنیائے اسلام کو کس طرح تہ و بالا کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ کیا کیا ذرائع استعمال کر رہی ہے مگر مسلمان اس ساری تشویشناک صورتِ حال سے کس قدر بے خبر ہیں۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مولانا عبدالعزیز صاحب نے یہودیوں کی اسلام کے خلاف سازش کا پس منظر بیان کیا ہے اور ان ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا ہے جو یہودیوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی تھیں۔

دوسرے باب میں مولانا ظفر احمد صاحب انصاری نے ان سازشوں کا تذکرہ کیا ہے جو یہودی دورِ خیر

میں دنیا تے اسلام کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے بعض نہایت حیران کُن معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں جو بظاہر اپنے آپ کو آزاد اور مختار کہتی ہیں، یہودیوں کے ہاتھ میں بے بس ہیں اور یہ انہیں جس طرح چاہتے ہیں آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یُوں تو یہ پوری بحث ہی بڑی مفید اور کارآمد ہے لیکن اس کا وہ حصہ جس میں انہوں نے اسلامی تحریکات اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خلاف یہودی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا ہے وہ نہایت ہی قابل قدر ہے۔ انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ عرب قوم پرستی کو کس طرح اور کن ناپاک مقاصد کے تحت تقویت پہنچائی جا رہی ہے اور اخوان المسلمین کی تباہی و بربادی میں صہیونیت کس حد تک ذمہ دار ہے۔

تیسرے باب میں صہیونی تحریک کے بارے میں مختصر معلومات چھوٹے چھوٹے مضامین کی صورت میں جمع کی گئی ہیں۔ مثلاً صہیونی، صہیونیت، پروٹوکول فری میسن مومنٹ اور امریکی اور انگریزی پریس کی یہود کے سامنے بے بسی۔ یہ سارے مضامین ہی اچھے ہیں، لیکن آخری دو مضامین یعنی فری میسن مومنٹ اور پریس پر یہودیوں کی عملداری خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ کس طرح یہ فری میسن مومنٹ جو بظاہر ایک ادارۂ خدمتِ خلق ہے مختلف ممالک میں صہیونی اثرات کے نفوذ میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے اور کس طرح ایونگ پوسٹ اور ٹائم جیسے جرائد صہیونی تحریک کے خلاف ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

کتاب کا آخری باب اُن خفیہ دستاویزات پر مشتمل ہے جن سے صہیونی تحریک کے خوفناک رجحانات اور عزائم کا علم ہوتا ہے۔ انہیں پروٹوکول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ذرا ان یہودیوں کے عزائم ملاحظہ ہوں۔

"ہم خفیہ دالفوں، زیرِ زمین سرگرمیوں اور سونے چاندی کی مدد سے جس پر ہمارا قبضہ ہے، پوری دنیا میں معاشی بحران پیدا کر دیں گے۔"

"ہمارے لیے یہ لازم ہے کہ ہم ہر مذہب اور ہر دین کی بنیاد کو کھوکھلا کریں۔"

صیہونیت سے باہر جن لوگوں نے بھی خدا کے بارے میں جو تصورات قائم کر رکھے ہیں انہیں مٹائیں اور ان کی جگہ مادّی احتیاجات اور ریاضی کے کلیوں کی عظمت اور محبت پیدا کریں۔

"اس وقت ہم دنیا کی ایک ناقابلِ تسخیر بین الاقوامی قوت ہیں کیونکہ اگر ہم پر ایک مملکت حملہ آور ہو تو بہت سے دوسرے ممالک ہماری معاونت اور محافظت کے لیے تیار ہوں گے۔"

"دنیا کی قومیں ہم سے بے نیاز ہو کر آپس میں کوئی معمولی سے معمولی معاہدہ بھی نہیں کر سکتیں۔"

"ہم جیسی غیر مرئی قوت کو کون شکست دے سکتا ہے۔ ہماری یہ قوت کن عناصر پر مشتمل ہے؟ فری میسن اور اس طرح کی ہماری دوسری تحریکات پر۔ اس نوعیت کے "خدمتِ خلق کے" اداروں ہمارے عزائم کو لوگوں کی نظروں سے مستور رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوت کے اصل مراکز لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں اور اس طرح ہماری سرگرمیاں دنیا کے لیے سربستہ راز ہی رہتی ہیں۔"

ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے چونکہ پوری امت کو اس عظیم خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے لکھا ہے اس لیے انہوں نے اس کتاب کی اشاعت اور اس کے ترجمے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ ہمیں امید ہے کہ مسلمان اسے زیادہ سے زیادہ نہ صرف خود پڑھیں گے بلکہ اسے پھیلانے کی بھی کوشش کریں گے۔ کتاب کی زبان معیاری اور طباعت عمدہ ہے۔

ماہنامہ چراغِ راہ زیرِ ادارت: جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے۔ سالانہ چندہ ۹ روپے۔

یہ معروف دینی ماہنامہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس نے اسلامی ادب اور مختلف سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر دینی اعتبار سے نہایت عمدہ مواد فراہم کیا ہے۔ اب

جنوری سے یہ ماہنامہ ادارۂ معارفِ اسلامی کے آرگن کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے چار شمارے جو ہمارے سامنے آئے ہیں ان کا معیار بڑا بلند اور عمدہ ہے اور اسے دیکھ کر اس مجلے کے بارے میں بڑی روشن توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ فاضل مدیر کے ادارتی نوٹ بڑے فکر انگیز اور معلومات افزا ہوتے ہیں

ISLAMIC IDEOLOGY AND ITS IMPACT ON OUR TIMES

(اسلامی آئیڈیالوجی اور ہمارے عہد پر اس کے اثرات)

تالیف: پروفیسر محمود بریلوی صاحب۔
شائع کردہ: پوسٹ بکس نمبر ۵۲۹۴ کراچی نمبر۲
صفحات: ۳۸۰۔ قیمت ۲۵ روپے

کتاب کے فاضل مصنف پروفیسر محمود بریلوی صاحب دنیائے اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اُن کی کئی ایک تصنیفات علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے پہلے حصّے میں اسلام کے نظریۂ حیات اور اس نظریہ کے اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی، سیاسی، قانونی اور معاشی مضمرات بڑے اختصار مگر قرینے سے بیان کیے گئے ہیں۔ پھر اسی حصے میں رجعت پسندی اور تجدد پسندی کے درمیان توازن قائم کرنے کی تلقین بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اسلام میں عورتوں کی حیثیت، اسلامی تہذیب، اسلام کے مغرب پر اثرات اور مغرب کے مسلمان ممالک پر اثرات کے متعلق بھی بعض اچھے مباحث ملتے ہیں۔
دوسرے حصے میں مسلم ممالک کا مختصر سا جائزہ بھی موجود ہے۔

پوری کتاب ایک گہرے جذبے اور خلوص کی آئینہ دار ہے۔ اس کے سارے مندرجات سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات یقیناً بہت زیادہ حوصلہ افزا ہے کہ انگریزی میں لکھنے والے کسی مصنف کی کتاب متوازن ہو اور اس کا پلڑا تجدد پسندی کی طرف جھکا ہوا نہ ہو۔ فاضل مصنف نے مسلم قوم کے مسائل حل کرنے کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع اور ائمہ سلف کی تصریحات کو ضروری سمجھا ہے۔ پھر انہوں نے ملت اسلامی کے اندر قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی بھی بڑی دیدہ دری سے نشاندہی کی ہے اور امت کو ان کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مسلمان ممالک کے متعلق بڑی مفید اور مستند معلومات فراہم کرتا ہے۔

معیار طباعت عمدہ ہے البتہ اغلاط کی کثرت نے اسے کافی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ کتاب چونکہ تبلیغ کی غرض سے لکھی گئی ہے اس لیے اگر اس کی قیمت کم ہوتی تو یہ زیادہ مناسب تھا۔

تاریخ طبری حصہ اول | تالیف: علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری۔ المتوفی سنہ ۳۱۰ھ۔ ترجمہ سید محمد ابراہیم صاحب ایم۔ اے ندوی۔ ترتیب و تبویب: جناب شبیر حسین قریشی ایم۔ اے۔ شائع کردہ: نفیس اکیڈیمی۔ کراچی صفحات ۵۴۴ قیمت مجلد ۱۶ روپے۔

علم تاریخ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں واقعات کو جوں کا توں، اپنے ذاتی رجحان کو الگ رکھتے ہوئے قلمبند کیا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں واقعات کی مختلف کڑیوں کے درمیان ایک مقصدی ترتیب اور معنوی ربط تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلا حصہ تاریخ نگاری اور دوسرا فلسفۂ تاریخ کہلاتا ہے۔

ابوجعفر محمد ابن جریر طبری کی معروف کتاب تاریخ الامم والملوک، تاریخ کے پہلے حصے یعنی واقعات کے تجزیہ کرنے میں امہات الکتب کا درجہ رکھتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی فاضلانہ تصنیف کے جزو اول کا ترجمہ ہے۔ اس میں سید الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے متعلق واقعات کو بڑی محنت سے قلمبند کیا گیا ہے۔ کتاب کے مصنف چونکہ بلند پایہ محدث اور مفسر ہیں اس لیے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ ان کا ذہن اس غیر جانبداری کا آئینہ دار ہے جو اس کام کے لیے ضروری ہے۔ اگر کلام الٰہی اور قولِ رسول میں انسان اپنے ذاتی رجحانات کو داخل کرنا شروع کر دے تو ان کی صحت مخدوش ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے اپنا سارا زور قولِ رسول معلوم کرنے پر صرف کیا اور جو چیزیں حضور سے انہیں قابلِ اعتماد ذرائع سے ملیں انہیں جوں کا توں نقل کر دیا اور یہ کام دوسرے اہل علم پر چھوڑا کہ وہ ان کے مضمرات بیان کریں۔ ابن جریر کا یہی انداز ہمیں ان کی اس کتاب میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے روایات کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے اور ان

پر جرح و تعدیل کا کام دوسرے اصحابِ علم کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود قوی اور ضعیف یا غلط و صحیح کے درمیان امتیاز کریں ۔ چونکہ یہ تاریخ کی کتاب ہے ، احادیث کی کتاب نہیں اس لیے واقعات کی چھان بین میں اور جن حضرات سے واقعات منقول ہیں اُن کے علمی اور اخلاقی مقام کو مشخص کرنے میں وہ احتیاط نہیں برتی گئی جو تدوینِ حدیث کے معاملے میں پیشِ نظر رکھی جاتی ہے ۔ اس لیے اس کتاب میں بہت سی غیر مستند چیزیں بھی جمع ہو گئی ہیں جن کی اہلِ علم نے پوری طرح نشاندہی کی ہے ۔ اس خامی کے باوجود یہ کتاب مستند مانی جاتی ہے اور شاید ہی کوئی مورخ ایسا ہو جو اس سے بے نیاز ہو سکا ہو ۔ کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت عمدہ ہے ۔

سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | تالیف : پروفیسر سید نواب علی صاحب ۔ شائع کردہ : مکتبہ افکار رالسن روڈ ، کراچی ۔ صفحات ۴۵۸ ۔ قیمت بارہ روپے ۔

مغربی قوموں نے مشرقی اقوام ، خصوصاً مسلمانوں پر جب یلغار کی تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ اس قوم سے تیر و تفنگ کا چھین لینا ، یا اسے معاشی طور پر برباد کر دینا اتنا مفید نہیں جتنا کہ اسے متاعِ ایمان سے محروم کر دینا ضروری ہے ۔ چنانچہ اس محاذ پر پیش قدمی کرنے کے لیے مستشرقین کی ایک فوج آگے بڑھی اور انہوں نے حضور سرورِ کائنات اور قرآن مجید پر مسلسل اور پیہم حملے شروع کیے ۔ بہت سے نامور اہلِ علم اسلام کے دفاع کے لیے آگے بڑھے ۔ ان میں سر سید ، امیر علی ، مولوی چراغ علی ، مولانا محمد علی جوہر ، علامہ شبلی اور پروفیسر سید نواب علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ سر سید کی علمی خدمات اپنی جگہ مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ وہ خود یورپ سے بڑے مرعوب تھے ۔ پھر اُن کی دینی معلومات بھی اتنی ٹھوس نہ تھیں کہ وہ اس محاذ پر جم کر مقابلہ کر سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نیک نیتی کے باوجود کئی ایک مقامات پر ٹھوکریں کھائیں ۔ امیر علی کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور وہ انگریزی زبان کے بڑے اونچے نثر نگار تھے لیکن اُن کے طرزِ استدلال میں بھی مرعوبیت کا رنگ پوری طرح جھلکتا ہے ۔ علامہ شبلی بڑی ٹھوس قابلیت کے عالم تھے ۔ انہوں نے مستشرقین کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر

سیرتِ نبوی کی تدوین کا کام کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا یہ کام بڑا قابلِ قدر ہے اور سیرت نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنّف پروفیسر نواب علی وہ صاحب علم ہستی ہیں جو علی گڑھ کی فضا میں پلنے کی وجہ سے سیرت نگاری میں نئے دور کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے۔ انہیں مستشرقین کی ریشہ دوانیوں کا اچھی طرح علم تھا۔ علمِ تقابلِ ادیان اُن کا خاص موضوع تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی علوم میں بھی کسی حد تک دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے مستشرقین کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر، سیرت کے اصل ماخذ کی بنیاد پر یہ کتاب تحریر فرمائی۔ علامہ شبلی کی سیرت النبی اور پروفیسر نواب علی کی سیرت رسول اللہ دونوں ایک ہی جذبہ کے تحت اور ایک ہی خاکہ کے مطابق مرتب کی گئی ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے سیرتِ رسول کو اس انداز سے لکھا ہے کہ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا خود بخود ازالہ ہوتا ہے۔ پروفیسر نواب علی نے ان غلط فہمیوں کے براہِ راست جوابات دیئے ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اور ہر طبقے میں مقبول ہوئی۔ مگر کچھ عرصے سے یہ مفید تصنیف نایاب تھی۔ مکتبہ افکار نے اسے دوبارہ طبع کیا ہے۔

اس کتاب کی خوبیوں کے باوجود ایک نمایاں خامی جو شروع سے آخر تک نظر آتی ہے یہ ہے کہ اس کے مصنف بھی مغربی افکار سے بڑے مرعوب ہیں اور وہ بعض اعتراضات سے اس قدر خائف ہیں کہ انہوں نے شریعت کے بعض اساسی تصورات تک میں ردوبدل کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مثلاً جنّات کے بارے میں اُن کے نقطۂ نظر کو کسی طرح بھی صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حال بعض دوسرے مباحث کا بھی ہے۔

اعتذار

کاغذ کی گرانی نے ہمیں صفحات میں تخفیف کے باوجود قیمت فی پرچہ پچھتر پیسے کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آئندہ حالات بہتر ہونے تک قیمت فی پرچہ یہی رہے گی۔ ایجنٹ صاحبان اور انفرادی خریدار نوٹ فرمالیں۔

(ادارہ)